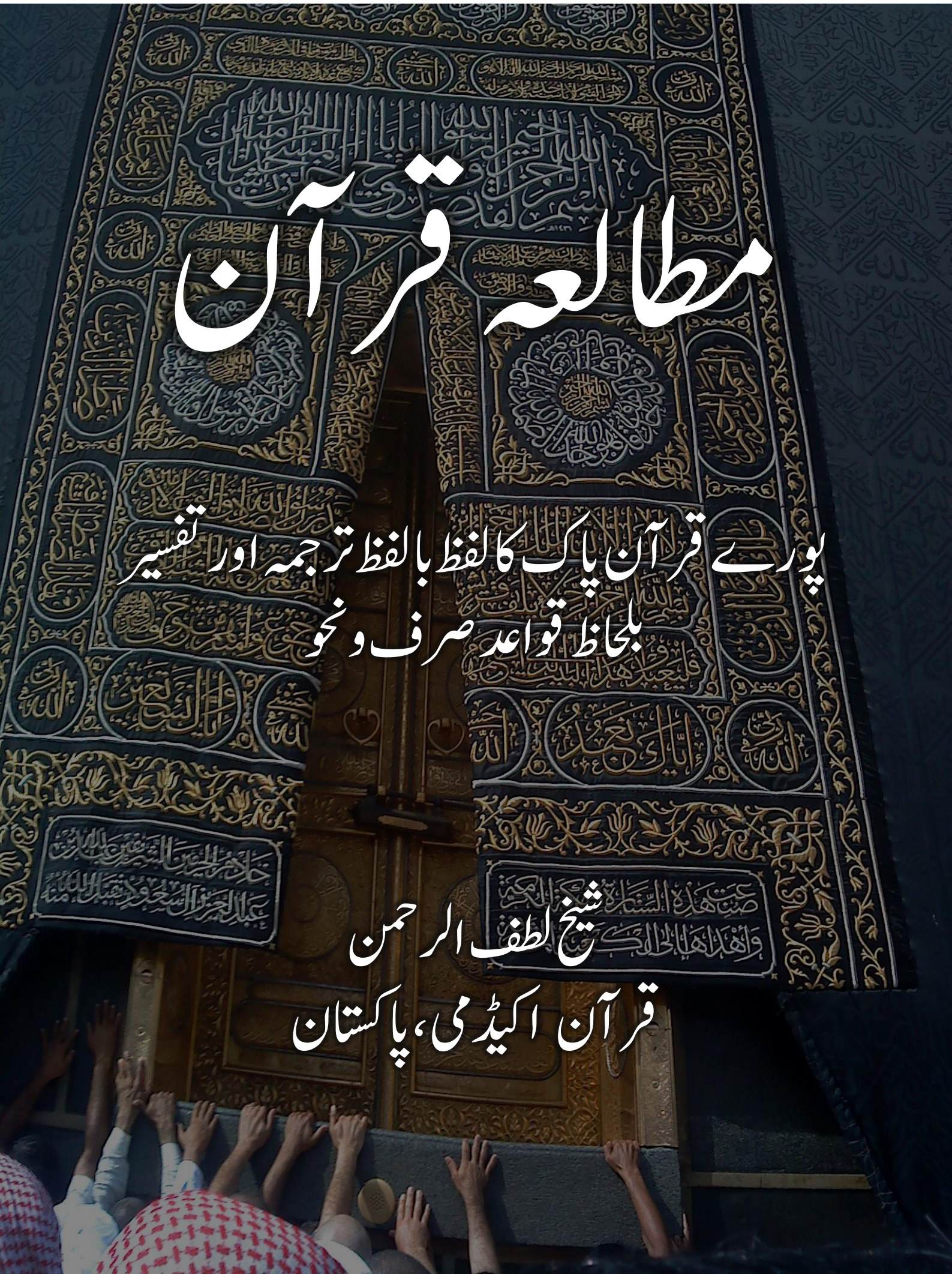

مطالعہ قرآن

پورے قرآن پاک کا لفظ بالفظ ترجمہ اور تفسیر
بلحاظ قواعد صرف و نحو

شیخ لطف الرحمن
قرآن اکیڈمی، پاکستان

تقریظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ترجمہ وتفسیر القرآن کی مساعیٔ حسنہ

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اپنے آخری نبی ورسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ساری دنیا کے انسانوں کے لیے ہدایت کی خاطر مبعوث کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے: ((لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ)) تاکہ دین حق کو تمام ادیانِ باطلہ پر غالب کردیں۔ چنانچہ اس حقیقت کا پوری دنیا میں اعتراف پایا جاتا ہے کہ مذاہبِ عالم میں اسلام ہی واحد دین ایسا ہے جو تا قیامت انسانوں کی ہر شعبۂ زندگی میں منفردانہ رہنمائی کا آئینہ دار ہے، اور کتب سماوی میں سے قرآن کریم ہی واحد کتاب ایسی ہے جو تحریف وتغیر سے پاک ہے اور حضور سید المرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر جس صورت اور جن معلومات اور حقائق پر مشتمل نازل ہوئی تھی بعینہٖ وہ آج بھی دنیا میں اسی طرح موجود ہے اور یہ واحد کتاب ایسی ہے جس کی ہمہ نوعیت کی حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا ہے اور ذمہ داری لی ہے جبکہ دیگر کتب سماویہ کی حفاظت اور ذمہ داری قبول کرنے کے احکام قطعاً نہیں ہیں۔

قرآن کریم کی حفاظت کے عملی اقدامات میں سے اُمت مسلمہ کے قائم کردہ تحفیظ القرآن، دینی تعلیم کے مدارس اور حلقہ ہائے تدریس، تعلیم اور تفسیر القرآن بھی ہیں، نیز قرآنی تدبر اور تفکر کے سلسلے میں جو مساعیٔ حسنہ بروئے کار آرہی ہیں وہ بھی تحفیظ القرآن اور غلبہ اسلام ہی کی مستحسن کوششیں ہیں۔

اس سلسلے میں دنیائے اسلام کے دوش بدوش اسلامی مملکت پاکستان میں بھی تدریس وتفہیم القرآن کی حتی المقدور کوششیں متلاشیانِ حق کے لیے مشعل راہ ہیں انہی میں سے ہمارے لائق صد تحسین عزیز ڈاکٹر جہاں زیب صاحب کی قابل ستائش وتبریک مساعیٔ حسنہ ہیں جو وہ باذوق اور سلجھے ہوئے جدید تعلیم یافتہ حلقے میں درس وتعلیم القرآن کے سلسلے میں انجام دے رہے ہیں۔ مجھے ان کے حلقۂ درسِ قرآن کریم میں شرکت اور ان کے طریقۂ تدریس کے مشاہدے کا موقع ملا ہے، مجھے بے حد خوشی اور اطمینان ہوا کہ ان کا انداز نہایت مؤثر اور عصر حاضر کے تقاضے کے عین مطابق ہے۔ وہ الفاظ کی صرفی اور نحوی تراکیب سے لے کر معانی اور تفسیر تک ماہرانہ دسترس رکھتے ہیں اور خوب مطالعۂ تفاسیر کرتے ہیں۔ مجھے مزید مسرت اس پر ہوئی کہ وہ اپنے حلقۂ درس میں پیش کیے گئے اسباق پر مشتمل ''مطالعۂ قرآن مجید'' کے نام سے کتاب شائع کرنے کا اہتمام کررہے ہیں جو ایک ایسی پیشکش ہے جس سے حلقۂ درس کے علاوہ امت مسلمہ کے دیگر افراد بھی استفادہ کرسکیں گے۔ یہ ایک مستحسن اقدام اور صدقہ جاریہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر جہاں زیب صاحب کو جہاں انسانی ظاہری بیماریوں کے علاج کا ماہر بنایا ہے اسی طرح انسانوں کی روحانی امراض کے صحیح علاج اور بالیدگی کے سلسلے میں اللہ ان کی مساعیٔ حسنہ میں مزید نکھار، ترقی اور فکر سلیم کی نعمتوں سے نوازتا رہے اور ان کی عرقریزیوں اور کاوشوں کو شرف قبولیت عطا کرے تاکہ امت مسلمہ کے افراد اس سے استفادہ کرکے دنیا اور آخرت میں کامرانی سے ہمکنار ہوسکیں۔ وَبِاللّٰہِ التوفیق۔

۶ ذی الحجہ ۱۴۳۱ھ
۱۳ نومبر ۲۰۱۰ء

دعا گو
مجاہد الحسینی
فاضل دار العلوم ڈابھیل (انڈیا)
کتاب سیرت پر اول صدارتی ایوارڈ یافتہ
سابق ایڈیٹر روزنامہ آزاد، روزنامہ نوائے پاکستان
ہفت روزہ خدام الدین، لاہور۔

رہائش:
۶۵۔ بی پیپلز کالونی
فیصل آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سنہری زنجیر کی ایک کڑی

قرآن کے پیاسوں کی پیاس بجھانے کے لیے فہم القرآن میں سہولتیں فراہم کرنے کا سلسلہ بہت قدیم بھی ہے، بہت طویل بھی ہے اور یہ ایک سلسلہ لامتناہی ہے۔اس کی تفصیل میں جانا یہاں مقصود نہیں ہے۔اس وقت صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ عربی کے شارٹ کورسز کرنے والوں کے لیے گرامر کے لحاظ سے قرآن مجید کے چھ اسباق مرتب کرنے کا جب میں نے فیصلہ کیا تھا، اس وقت مجھے یاد آیا تھا کہ خود میں نے جب عربی پڑھنے کے بعد قرآن کو از خود سمجھنے کی کوشش کی تھی تو سب سے زیادہ مشکل مجھے عربی ڈکشنری دیکھنے میں پیش آتی تھی۔ کیونکہ کوئی لفظ عربی ادب میں جتنے معانی میں استعمال ہوتا ہے وہ تمام معانی ڈکشنری میں دیے ہوتے تھے اور مجھے یہ فیصلہ کرنے میں مشکل بھی ہوتی تھی اور وقت بھی لگتا تھا کہ اس آیت میں یہ لفظ کس معنی میں آیا ہے۔ امام راغب اصفہانیؒ کی مفردات القرآن نے بڑی حد تک اس مشکل کو آسان کیا۔ کیونکہ اس میں صرف اُن الفاظ کے مادے دیے گئے ہیں جو قرآن میں استعمال ہوئے ہیں اور ہر لفظ کے زیادہ تر وہی معنی دیے ہیں جس معنی میں وہ قرآن میں آیا ہے۔اور قرآن مجید کی آیات کا حوالہ بھی دیا گیا ہے جس کی وجہ سے ہمارے جیسے قرآن کے مبتدی طلبہ کو الفاظ کے معنی سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔اس آسانی کے ساتھ کچھ تشنگی بھی محسوس ہوئی۔ ایک یہ کہ اُس میں یہ نہیں دیا ہے کہ کوئی مادہ ثلاثی مجرد کے کس باب میں آتا ہے۔ نیز یہ کہ کسی مادہ سے بننے والے جتنے الفاظ قرآن میں آئے ہیں، اُن میں سے چند ایک کی وضاحت کی گئی ہے، باقی بہت کچھ طلبہ کی ذہانت پر چھوڑ دیا گیا ہے۔اب مسئلہ یہ ہے کہ عقلمنداں را اشارہ ہی است، قسم کے عقلمند طلبہ امام صاحب کے زمانے میں ہوا کرتے تھے۔آج کل تو ہمارے جیسے طلبہ کی اکثریت ہے۔اس لیے اس خلا کو پر کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

چنانچہ مطالعہ قرآن حکیم کے اسباق مرتب کرنے میں آیات کی ترکیب (Sentence Analysis) سے پہلے الفاظ کے معانی بھی دینے کا فیصلہ کیا اور طے کیا کہ ہر مادے کا ثلاثی مجرد میں استعمال دیا جائے گا، خواہ اُس باب کے کوئی فعل قرآن مجید میں آیا ہو یا نہ آیا ہو۔اس کے ساتھ ہی اُس مادہ سے بننے والے جتنے الفاظ قرآن مجید میں آئے ہیں، اُن سب کے معانی آیات کے حوالے کے ساتھ جائیں گے۔ اِس کوشش میں بھی البلاغ فاؤنڈیشن کے متعدد طلبہ متعدد پہلوؤں سے تشنگی محسوس کر رہے ہیں۔ مثلاً افعال میں مفعول کے ساتھ صلہ کا استعمال نہیں دیا ہے، اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰہ۔ چند الفاظ کو چھوڑ کر زیادہ تر الفاظ کے لغوی مفہوم اور اصطلاحی مفہوم کے باہمی ربط کو نہیں کھولا گیا ہے۔ مترادفات القرآن یعنی ایسے الفاظ جو ہم معنی یا قریب معنی ہوں، جیسے جَاءَ (آنا)، قَدِمَ (آنا)۔ اَتٰی (آنا)، اُن الفاظ کے باہمی تقابل اور فرق کی وضاحت نہیں کی گئی، وغیرہ۔طلبہ نے جب میری اِن فروگزاشتوں کی نشاندہی کرنا شروع کی تھی اُس وقت تک میں تقریباً ۲۴، ۲۵ پاروں کے اسباق مرتب کر چکا تھا اور میرے لیے عملاً اِن تشنگیوں کو دور کرنا ممکن نہ رہا تھا۔ البتہ میری خواہش بھی تھی اور دعا بھی کہ اللہ تعالیٰ اپنے خصوصی فضل سے کسی کو توفیق دے کہ وہ مذکورہ خلاؤں کو پر کر دے۔

یہ جان کر مجھے خوشی بھی ہوئی ہے اور میں نے اپنے رب کا شکر ادا کیا ہے کہ فاؤنڈیشن کے ایک طالبعلم ڈاکٹر جہاں زیب ندیم سلمہٗ نے اس کام کو مکمل کرنے کا نہ صرف عزم کیا ہے بلکہ بڑی عرق ریزی کے ساتھ اس کی ابتداء بھی کر دی ہے۔اس بات پر مجھے انشراح صدر حاصل ہے کہ ڈاکٹر جہاں زیب سلمہ کی یہ کاوش فہم القرآن کے لیے سہولتیں فراہم کرنے والی سنہری زنجیر کی ایک اہم کڑی ثابت ہوگی۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں استطاعت اور استقامت عطا فرمائے اور ان کے ہاتھوں اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دے۔اور اس کام کو ان کے لیے اور ان کے تمام معاونین و کارکنان کے لیے بہترین صدقۂ جاریہ اور ذخیرہ آخرت بنا دے۔ (آمین)

لطف الرحمٰن خان
البلاغ فاؤنڈیشن لاہور
مورخہ ۲۱ ذیقعدہ ۱۴۳۱ھ
بمطابق ۳۰ اکتوبر ۲۰۱۰ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن حکیم، اللہ تعالیٰ کا نوع انسانی کے نام آخری مستند (authentic) کلام ہے جو نوع انسانی کی ہدایت و رہنمائی کے لیے نازل ہوا۔ کلام بلاشبہ اللہ کا ہے، لیکن اللہ نے نوع انسانی تک اسے پہنچانے کے لیے اپنے محبوب ترین بندے، فخر موجودات، رسول کامل، محمد عربی ﷺ کو ذریعہ بنایا اور انہی کو ''رحمۃ اللعالمین'' کے اعلیٰ ترین لقب سے سرفراز فرمایا۔ بقول علامہ اقبال ؎

نوع انسانی را پیامِ آخریں حامل اُو رحمۃً للعالمین

اللہ کا یہ ابدی پیغام صرف اہل عرب کے لیے نہیں تھا، پوری نوع انسانی کے نام تھا محض چودہ سو سال قبل کے اُس دور کے لیے نہیں تھا جب یہ نازل کیا گیا، بلکہ قیامت تک آنے والے ہر انسان کے نام تھا۔ نبی آخر الزمان ﷺ اپنی 63 سالہ حیات دنیوی میں جزیرہ نمائے عرب کی حد تک اپنے مشن کی تکمیل فرما کر، رفیق اعلیٰ کی طرف مراجعت فرما گئے۔ خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر ایک لاکھ سے زائد امتیوں سے یہ گواہی لے کر کہ ''انا نشھد انك قد بلغت و ادیت و نصحت'' اس مشن کو امت کے کندھوں پر منتقل کرتے ہوئے فرمایا کہ ''فلیبلغ الشاھد الغائب'' یعنی جو لوگ یہاں موجود ہیں اور اس بات کے گواہ ہیں کہ میں نے اللہ کے پیغام کو پہنچانے کا ہر اعتبار سے حق ادا کر دیا ہے وہ اب اس پیغام کو بقیہ نوع انسانی تک پہنچانے میں اپنا کردار ادا کریں۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ آج یہ اُمت بحیثیت مجموعی اپنے اس اہم فرض منصبی کو فراموش کر چکی ہے۔ علامہ اقبال نے اس حوالے سے قوم کو جگانے کی کوشش کی تھی۔ ''جوابِ شکوہ'' میں اللہ کی طرف یہ پیغام نہایت خوبصورت الفاظ میں امت تک پہنچایا ؎

وقت فرصت ہے کہاں، کام ابھی باقی ہے نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے!

اگرچہ یہ تلخ حقیقت ہے کہ امت بحیثیت مجموعی اس ذمہ داری سے غافل ہے، لیکن یہ بھی امر واقعہ ہے ہر دور میں کچھ لوگ امت میں اس مشن کو لے کر آگے بڑھتے رہے ہیں، اور سچی بات تو یہ ہے کہ آج اس حوالے سے کرنے کا اہم ترین کام یہ ہے کہ خود مسلمانوں کا رشتہ قرآن مجید کی ساتھ از سر نو جوڑا جائے اور انہیں قرآن کے ابدی پیغام اور کامل ہدایت کی طرف موثر انداز میں متوجہ کیا جائے۔ قرآن حکیم کو محض ایک مقدس کتاب کا درجہ دینے کی بجائے اسے فی الواقع کتاب ہدایت کے طور پر متعارف کیا جائے اور اسے سمجھ کر پڑھنے اور اس کی علمی و عملی رہنمائی سے فائدہ اٹھانے کی طرف انہیں آمادۂ عمل کیا جائے۔ اس معاملے میں ابتدائی اور اہم رکاوٹ زبان کی مغائرت ہے۔ عربی زبان سے ایک خاص حد تک واقفیت جب تک نہ ہو، ہم اس کلام کی عظمت اور اس کی دلوں کو بدل دینے اور باطن میں انقلاب برپا کرنے والی تاثیر سے صحیح طور پر استفادہ نہیں کر سکتے۔ بقول اقبال ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

قرآن کے نور ہدایت اور اس کی تاثیر سے حقیقی معنوں میں استفادے کے لیے عربی زبان اور اس کے قواعد کا فہم ناگزیر ہے۔ اسی ضمن میں اُن طالبانِ قرآن کی سہولت کی خاطر جو قرآن حکیم سے براہِ راست استفادہ کی لذت سے اپنے قلوب کو شاد کام کرنا چاہتے ہیں، بعض عاشقانِ قرآن نے تعلیم و تعلّم قرآن کو اپنی زندگی کا مشن بنایا اور فہم قرآن کی رکاوٹوں کو دور کرنے کے حوالے سے طالبان قرآن کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیا۔ زیر نظر کتاب کے مؤلف برادرم ڈاکٹر جہاں زیب ندیم بھی ان خوش نصیب لوگوں میں سے ہیں جن کو اللہ نے اس مبارک گروہ کا حصہ بننے کی سعادت عطا فرمائی۔ انہوں نے اپنی دیگر ہمہ جہت دنیاوی مصروفیات کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کے حوالے سے اُس مشن کو آگے بڑھانے کی خاطر نہایت محنت اور عرق ریزی کے ساتھ کام کیا جس کا آغاز بقول برادرم ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب، اس دور میں استاد محترم حافظ احمد یارؒ نے کیا تھا اور جسے اوّلاً ان کے ایک شاگرد محترم لطف الرحمٰن صاحب نے آگے بڑھایا اور جس میں مزید آگے قدم بڑھانے کی سعادت برادرم ڈاکٹر جہاں زیب ندیم صاحب کو حاصل ہوئی۔ یہ کام بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی کاوشوں کو شرف قبول عطا فرمائے اور جس نہایت اہم کام کا آغاز انہوں نے اللہ تبارک و تعالیٰ کے بھروسے پر کیا ہے اسے مکمل کرنے کی ہمت اور توفیق بھی عطا فرمائے۔

ع ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد!

احقر

حافظ عاکف سعید عفی عنہ

امیر تنظیم اسلامی

سرپرست انجمن خدام القرآن، فیصل آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن حکیم کلامُ اللہ ہے اور رسول اللہؐ کا ارشاد ہے: ''کلام اللہ کی فضیلت و برتری دیگر تمام کلاموں پر ایسے ہے جیسے خود اللہ کی فضیلت اس کی تمام مخلوقات پر۔''

قرآن حکیم اپنی اس غیر معمولی عظمت کے ساتھ معجزۂ خالدہ ہے اور رہتی انسانیت کے لیے سرچشمۂ ہدایت اور منبعِ علم و عرفان ہے۔ ہر دور میں اربابِ فکر و دانش نے اپنے اپنے شعبۂ ہائے تخصّص کے مطابق مختلف پہلوؤں سے اسے مطالعہ و تحقیق کا موضوع بنایا ہے اور زمانے کے نت نئے تقاضوں کے مطابق اس سے ہدایت کشید کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ آخری آسمانی معجز کتاب وہ بحرِ ناپیدکنار ہے جس میں مزید غوّاصی کی گنجائش ہمیشہ موجود رہے گی۔

ڈاکٹر جہانزیب ندیم صاحب انجمن خدام القرآن فیصل آباد سے وابستہ ایک علم دوست کارکن ہیں جنہوں نے بنیادی طور پر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے استفادہ کرتے ہوئے عربی زبان و گرامر اور فہم قرآن کو اپنی محنت کا میدان بنایا اور قابل قدر استعداد حاصل کر کے قرآنِ حکیم کے درس و تدریس میں جتے ہوئے ہیں۔

باذوق احباب کے مشورے سے انہوں نے ایک وقیع کام کا بیڑا اُٹھایا ہے اور وہ یہ کہ تفاسیر اور عربی لغت و گرامر کی معاون کتب سے استفادہ کرتے ہوئے آیت در آیت تین قسم کا مواد ترتیب دیا جائے:

(۱) ہر نئے کلمہ کی ایسی لُغوی تشریح کہ اُس کے تین حرفی مادے سے نکلتی ہوئی جتنی شکلیں بھی قرآن میں کہیں استعمال ہوئی ہیں ان کا احاطہ ہو جائے اور معنوی تغیر و ارتقاء سامنے آ جائے جس سے ایک مادۂ اشتقاق رکھنے والے تمام کلماتِ قرآنی کے درمیان ربط قائم ہو کر تفسیرُ القرآن بالقرآن کی راہ ہموار ہو سکے۔

(۲) ہر آیت کے ہر جملہ کی نحوی ترکیب عام فہم انداز میں بیان کر دی جائے۔

(۳) اہم الفاظ و تعبیراتِ قرآنی پر جامع نوٹس بیان کر دیے جائیں جن کی روشنی میں ان الفاظ و تعبیرات و اصطلاحات کی معنوی گہرائی و گیرائی بھی سامنے آئے اور مختلف مفسرین کے نقطۂ ہائے نظر سے بھی آگاہی ہو جائے۔

بتوفیقہٖ تعالیٰ راقم الحروف تقریباً دو دہائیوں سے قرآنِ حکیم کی تدریس سے وابستہ ہے جس میں مدارس کے نصاب کے مطابق تدریس کے علاوہ عوامی درسِ قرآن اور جدید تعلیم یافتہ طبقات کے لیے فہم قرآن کلاسز وغیرہ کا سلسلہ شامل ہے۔ راقم اپنے اس تدریسی تجربہ کے ضمن میں قدرے وسعت کے ساتھ اس منہج پر تالیفی کام کی ضرورت محسوس کرتا اور اسے اپنے ہدف میں شامل رکھے ہوئے تھا، لیکن معمولی پیش رفت کے بعد یہ کام تعطّل کا شکار تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے حُسنِ ظن کے تحت اپنے اس تالیفی کام پر نظر ثانی کو فرمایا تو راقم نے اسے اپنے ہدف کی تکمیل گردانتے ہوئے غنیمت سمجھا اور راقم اس کا معترف ہے کہ اس مجموعہ کے مرحلہ وار مطالعہ کے نتیجے میں کچھ افادہ تو نجانے کر پایا یا نہیں، لیکن بحمد للہ استفادہ کا موقع ضرور ملا ہے اور ڈاکٹر صاحب اس کام میں موفّق و منصور نظر آئے ہیں۔

شاید اس امر کا اظہار بھی مناسب ہو کہ بعض غیر عالم عصری تعلیم یافتہ حضرات جب مطالعہ کے زور پر یا چند شارٹ کورسز کر کے دینی تعلیم و تدریس یا تالیف کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو راسخین فی العلم سے اپنے کو مستغنی سمجھ لیتے ہیں، دینی مسائل و علوم میں رائے زنی میں بیباک ہو جاتے ہیں اور اپنی غیر معمولی قابلیت کے زعم میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں، لیکن بحمد للہ انجمن خدام القرآن فیصل آباد کے حضرات ڈاکٹر عبد السمیع صاحب اور ان کے لائق تلامذہ ڈاکٹر جہانزیب صاحب اور ماہر عربیت عامر سہیل صاحب وغیرہ کو راقم نے اس سے کوسوں دُور پایا ہے۔ یہ حضرات اپنے دائرہ کار سے بخوبی واقف ہیں، اپنے مبلغِ علم سے زائد کے لیے اپنے کو اہلِ علم و فضل کا محتاج سمجھتے ہیں اور اپنے زیرِ درس احباب کو بھی اسی کی تلقین کرتے ہیں۔ زیرِ نظر مجموعہ میں بھی ڈاکٹر صاحب نے شاید ہی کہیں اپنی بات کی

ہو، معروف تفاسیر ہی کا تتبّع کیا ہے اور اسلوبِ نگارش بھی عمدہ ہے۔

ابتدائی عربی زبان وگرامر سے واقف ایسے حضرات جو قرآن فہمی میں رُسوخ چاہتے ہوں اور بڑی تفاسیر تک رسائی کے خواہاں ہوں وہ درمیانے مرحلے کے طور پر اگر اس مجموعہ کا مطالعہ کریں تو بہت مفید ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس تالیف کے نفع کو عام وتام فرمائیں اور پہلی جلد کے بعد بقیہ جلدوں کی ترتیب وتدوین اور طباعت واشاعت آسان فرمائیں۔

آمین بحرمة سید المرسلین علیه الصلاة و التسلیم

سعید احمد
فاضل وفاق المدارس العربیہ پاکستان
متخصّص جامعہ دارالعلوم کراچی
ایم اے عربی انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد
امام وخطیب جامع مسجد الامین ستیانہ روڈ فیصل آباد
استاذ الحدیث جامعۃ الفرقان جڑانوالہ روڈ فیصل آباد
مرتب شارٹ اسلامک کورسز (النور ٹرسٹ)

28-03-2016

بسم اللّٰہ الذی یسر القرآن للذکر

استادمحترم پروفیسر حافظ احمد یار صاحب نے لغت القرآن پر جو کام شروع کیا تھا اس کو اولاً لطف الرحمٰن خان صاحب اور اب عزیزم ڈاکٹر جہانزیب ندیم نے تفسیری زاویے کے اضافے کے ساتھ بڑی عرق ریزی سے آگے بڑھایا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کاوش کو ان کے حق میں قبول فرمائے اور ان کے والدین کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔ ڈاکٹر جہانزیب نے یہ کام کسی مشغلے کے طور پر نہیں بلکہ اسی لگن اور priority کے ساتھ کیا ہے جیسے انہوں نے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج سے M.B.B.S کیا تھا۔ موصوف کی یہ کاوش انشاءاللہ قرآن مجید کے طالب علموں اور قرآن حکیم پڑھانے والے مدرسین اور قرآن مجید پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے ایک reference book کا کام کرے گی، انشاءاللہ۔

ڈاکٹر عبدالسمیع
صدر انجمن خدام القرآن فیصل آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ مرتب

نَحْمَدُہٗ وَ نُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ ... اَمَّا بَعْدُ!

ایں سعادت بزورِ بازو نیست

تا نہ بخشد، خدائے بخشندہ

اس ناچیز نے تو زندگی میں کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ کبھی قرآن مجید کے اسباق صرف، نحو اور لغت کے اعتبار سے مرتب کرے گا بلکہ راقم الحروف کی زندگی جس نہج پر گزر رہی تھی، اس زندگی میں اگر ناظرہ قرآن پڑھنے کا موقع ہی مل جاتا تو غنیمت تھا۔ یہ سب اللہ تعالیٰ ہی کا فضل ہے کہ آج راقم الحروف اپنے ''مطالعۂ قرآن مجید'' کی پہلی جلد کے لیے ''عرضِ مرتب'' لکھ رہا ہے۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ دل کے کسی کونے میں دین کی خدمت کی تمنّا ضرور تھی اور یہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کا خصوصی فضل ہے کہ زندگی کے نشیب و فراز میں یہ تمنّا قائم رہی۔

راقم الحروف کو سب سے پہلے جس شخصیت نے اسلام کی حقّانیت سے متعارف کروایا وہ ہیں جناب ڈاکٹر ذاکر نائیک صاحب۔ اِن کے بعد دو شخصیات ایسی ہیں جنہوں نے احقر کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ وہ دو شخصیات ہیں محترم جناب احمد دیدات صاحبؒ اور محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ ہی وہ شخصیت ہیں جنہوں نے ناچیز کو قرآنِ مجید کے ساتھ جوڑا اور قرآنِ مجید کے پیغام سے روشناس کروایا۔ ان ہی کے کہنے پر ناچیز نے عربی زبان کے بنیادی قواعد جناب لطف الرحمٰن خان صاحب (آسان عربی گرائمر حصّہ اوّل، دوم اور سوم)، محترم جناب ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب اور محترم جناب عامر سہیل صاحب سے سیکھے۔ لیکن میرا ہرگز یہ دعویٰ نہیں کہ میں نے عربی زبان میں مہارت حاصل کر لی ہے۔ بہرحال اپنی تمام تر کم علمی کے باوجود اساتذہ کے کہنے پر ابتدا میں کچھ عربی کلاسز اور کچھ سورتوں کی صرفی و نحوی تحلیل کی کلاسز پڑھائیں۔ پھر اساتذہ ہی کے کہنے پر درسِ قرآن کا آغاز کیا حالانکہ راقم الحروف اب بھی اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھتا۔ بہرحال اس ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے احقر نے ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ کے دروس سے فائدہ اٹھانے کے ساتھ ساتھ دو کاموں کو ضروری جانا: ایک یہ کہ دورِ حاضر کے مستند علماء سے رجوع کیا جائے اور دوسرے یہ کہ جید علمائے کرام کی مستند تفاسیر سے استفادہ کیا جائے۔ چنانچہ سب سے پہلے راقم الحروف نے حضرت مولانا مجاہد الحسینی صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر قرآنِ مجید پڑھانے کی درخواست کی لیکن حضرت کی کبرسنی اور جسمانی صحت نے اس کی اجازت نہیں دی البتہ حضرت نے راقم الحروف کے حلقہ مطالعہ قرآنی میں شرکت کی حامی بھر لی اور پھر کچھ عرصہ باقاعدگی سے شرکت بھی کی۔ اس کے بعد جامعہ امدادیہ فیصل آباد کے جناب مفتی شعیب صاحب سے راقم الحروف نے کچھ عرصہ استفادہ کیا۔ پھر جناب مفتی سعید احمد صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر قرآن اور حدیث پڑھانے کی درخواست کی جو حضرت نے قبول کر لی اور ان سے باقاعدہ پڑھنے کا آغاز ہوا جو کہ تاحال جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ تفاسیر کے ذریعے جن بزرگوں سے قلبی اور روحانی تعلق قائم ہوا، ان کی بھی ایک لمبی فہرست ہے۔ سب سے زیادہ جن دو بزرگوں کو راقم الحروف نے اپنے قلب و روح کے قریب محسوس کیا وہ ہیں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ اور حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی صاحبؒ۔ ان دونوں بزرگوں کی تفسیر عثمانی بلاشبہ بہترین تفسیروں میں سے ایک ہے۔ اِن کے بعد جن بزرگوں کی تفاسیر سے احقر نے سب سے زیادہ راہنمائی حاصل کی وہ ہیں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی صاحبؒ (بیان القران)، مفتی محمد شفیع صاحبؒ (معارف القرآن)، مولانا عبدالماجد دریابادی صاحبؒ (تفسیر ماجدیؒ)، حضرت مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ (تفہیم القرآن)، حضرت پیر کرم شاہ صاحبؒ (ضیاء القرآن)، حضرت مولانا محمد جونا گڑھیؒ اور حضرت مولانا صلاح الدین یوسفؒ (تفسیر

احسن البیان)، حضرت مولانا عبدالحق حقانی صاحبؒ (تفسیر فتح المنّان المشہور بہ تفسیر حقانی) اور حضرت مولانا امین احسن اصلاحی صاحبؒ (تدبر قرآن)۔ اِن تمام بزرگوں کی تفاسیر امت کا سرمایۂ علم ہیں اور حقیقت میں ان بزرگوں کے ساتھ تعلق کی وجہ بھی محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ ہی ہیں۔ ہندوستان کی ایک اور نہایت اہم شخصیت جن سے تعلق کا ذریعہ بھی محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ ہی بنے، وہ ہیں شاعرِ مشرق، علامہ محمد اقبال۔ حالانکہ احقر نہ کبھی اردو ادب کا طالب علم رہا ہے نہ ہی شاعری سے کوئی خاص لگاؤ ہے لیکن علامہ اقبال کی شاعری نے احقر کے قلب وجگر پر اَن مِٹ نقوش چھوڑے ہیں۔

احقر کی قرآنی خدمت ''مطالعۂ قرآنِ مجید'' کی بنیاد استادِ محترم جناب لطف الرحمٰن خان صاحب کی قرآنی خدمت ''مطالعہ قرآنِ حکیم'' پر ہے۔ اس خدمت کے لیے مندرجہ بالا کتب کے علاوہ امام راغبؒ کی مفردات القرآن، مولانا عبدالرشید نعمانیؒ کی لغات القرآن، مولانا عبدالرحمٰن کیلانیؒ کی مترادفات القرآن اور مصباح اللغات سے بھی بھرپور استفادہ کیا گیا ہے۔ نحوی تراکیب کے لیے محیي الدین الدرویشؒ کی ''اعراب القرآن الکریم و بیانه''، محمد سید طنطاویؒ کی ''نور الیقین معجم و سیط فی اعراب القرآن الکریم'' اور محمود سلیمان یاقوتؒ کی ''اعراب القرآن الکریم'' سے استفادہ کیا گیا ہے۔ البتہ نحوی ترکیب کو سادہ اور عام فہم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

دیکھیے میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں ہرگز اس کام کی اہلیت نہیں رکھتا اور نہ ہی میرے قلم میں ایسا زور ہے کہ اس خدمت کے ذریعے میں قرآن فہمی کے راستے سے تمام رکاوٹیں دور کر دوں۔ اپنی اِن تمام کوتاہیوں کا پورا احساس ہوتے ہوئے بھی اِس خدمت کا کچھ حصہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کی وجہ میرے پاس اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ اللہ ربّ العزّت نے ہی ایسا چاہا اور یہ ہو گیا۔ اسی مسبّب الاسباب نے اسباب فراہم کر دیے اور اسی کی توفیق سے یہ خدمت ہو سکی۔ اب اسی سے دعا ہے کہ نبی اکرمؐ کے طفیل اس خدمت کو شرف قبولیت عطا فرمائے اور اسے عام کر دے۔ اس ''مطالعہ قرآنِ مجید'' کو پڑھتے ہوئے اگر کہیں کوئی خوبی نظر آئے تو یقین کیجیے کہ اُس کی تعریف کی مستحق وہ ہستیاں ہیں جن کی خدمتِ قرآنی سے استفادہ کیا گیا اور کہیں کوئی کمی اور نقص نظر آئے تو اس کا ذمہ دار یہ احقر ہے۔

کوشش بھی ہے اور دعا بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ غلطیوں اور کوتاہیوں سے بچاتے ہوئے، خاص اپنی رحمت اور توفیق سے یہ کام پورا کروا دے۔ اہل علم سے بھی درخواست ہے کہ غلطیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کر کے اس کی اصلاح میں مدد کریں۔

آخر میں مَیں ہر اس شخص کا شکر گزار ہوں جس نے کسی بھی درجے میں اس تالیف میں میری مدد کی۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو بھی جزائے خیر عطا فرمائے اور میرے والدین، میرے بہن بھائیوں، بیوی بچوں، اساتذہ اور دوستوں سب کے لیے اسے صدقہ جاریہ اور ذخیرۂ آخرت بنا دے۔ آمین۔

وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ○

جہاں زیب ندیم
انجمن خدام القرآن، فیصل آباد
jjzee4567@gmail.com
00-92-322-8664004

اِسْتِعَاذَۃٌ

﴿ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ﴾

ع و ذ

باب	مصدر/اسم	معانی
(ن)	(۱) مَعَاذًا	مَعَاذًا مصدر میمی ہے۔کسی کی پناہ میں آنا۔پناہ طلب کرنا۔کسی کا دامن مضبوطی سے پکڑ لینا۔﴿ وَ اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَ رَبِّکُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ ۝۲۰ ﴾(44/الدّخان:20)''اور میں پناہ لے چکا ہوں اپنے رب اور تمہارے رب کی اس بات سے کہ تم مجھ کو سنگسار کرو۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ)﴿ وَّ اَنَّہٗ کَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ یَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ ﴾ (72/الجن:6)''اور یہ کہ تھے کتنے مرد آدمیوں میں سے پناہ پکڑتے تھے کتنے مردوں کی جنوں میں سے۔''
	(ب) مَعَاذٌ	مَعَاذٌ اسم ذات بھی ہے جس کا مطلب ہے،''پناہ''۔
(افعال)	اِعَاذَۃً	کسی کو کسی کی پناہ میں دینا۔﴿ وَ اِنِّیْٓ اُعِیْذُھَا بِکَ ﴾(3/آل عمران:36)''اور میں اس کو تیری پناہ میں دیتی ہوں۔''باب افعال میں فعل کے ساتھ اُس کا مفعول بنفسہٖ آتا ہے اور پھر''ب''صلہ کے ساتھ اُس کا ذکر ہوتا ہے جس کی پناہ میں اُس مفعول کو دیا جائے۔
(تفعیل)	تَعْوِیْذًا	خود کسی کو پناہ دینا۔اس باب سے قرآن میں فعل استعمال نہیں ہوا۔
(استفعال)	اِسْتِعَاذَۃً	کسی کی پناہ طلب کرنا۔﴿ فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝۹۸ ﴾(16النحل/:98)''پس جب تم قرآن پڑھو تو اللہ کی پناہ مانگو مردود شیطان سے۔''شاید اس حکم کے نتیجے میں اَعُوْذُ کا صیغہ استعمال ہوتا ہے یعنی میں آتا ہوں اللہ کی پناہ میں۔(واللہ اعلم)

شیطان: لغت میں اس کے دو مادے آتے ہیں۔

(۱) ش ط ن

(ن)	شَطْنًا	کسی سے دور ہونا۔کسی کی مخالفت کرنا۔عربی زبان میں بِئْرٌ شَطُوْنٌ کا مطلب ہے بہت گہرا کنواں یعنی جس کا پانی دور ہو۔ اسی طرح شَطَنَ الرَّجُلُ کا مطلب ہے آدمی حق سے دور ہوا۔
	شَیْطٰنٌ	ج:شَیَاطِیْنُ۔ش ط ن مادے سے فَیْعَالٌ کے وزن پر شَیْطٰنٌ بنتا ہے جس کا مطلب ہے بہت زیادہ دور ہونے والا اللہ کی رحمت سے یا حق سے۔بہت زیادہ مخالفت کرنے والا حق کی۔

(ب)ش ی ط

(ض)	شِیَاطَۃً، شَیْطًا	غصے سے سوختہ ہو جانا۔جلنا
	شَیْطٰنٌ	ش ی ط مادے سے فَعْلَانٌ کے وزن پر شَیْطٰنٌ بنتا ہے اور یہ مبالغے کا صیغہ ہے جس کا مطلب ہے بہت زیادہ جلنے والا، بہت زیادہ غصے سے سوختہ ہونے والا۔
نوٹ:	شَیْطٰنٌ	شیطان ایک صفاتی نام ہے جو ہر سرکش کو کہتے ہیں خواہ جن ہو، انسان ہو یا حیوان ہو۔جو بھی حق سے دوری اختیار کرے اور اُس کی مخالفت کرے وہ شیطان ہے۔سب سے پہلے جس نے یہ کام کیا وہ ایک جن تھا اور اس سرکشی کی وجہ سے اُسے شیطان اور ابلیس کہا جاتا ہے۔ابلیس بھی صفاتی نام ہے۔اُس جن کا اصل نام عزازیل تھا(بحوالہ تفسیر ماجدیؒ،ص:925)۔

اسی طرح انسان کی ہر بری خصلت کو بھی شیطان کہا جاتا ہے اَلْحَسَدُ شَیْطَانٌ وَالْغَضَبُ شَیْطَانٌ (مفردات)۔شیطان کے مجازی معنی بدہیئت (بدشکل) سانپ کے بھی ہیں اور آیت ﴿ طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ ﴾ (37/ الصّٰفّٰت:65) میں یہی معنی مراد ہیں۔تفسیر ماجدیؒ میں اس کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے ''اُس کے پھل ایسے ہیں جیسے سانپ کے پھن۔'' تفسیر عثمانیؒ میں اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے ''یعنی سخت بدنما شیطان کی صورت یا شیاطین کہا سانپوں کو یعنی اُس کا خوشہ سانپ کے سر کی طرح ہوگا جیسے ہمارے ہاں ایک درخت کو اسی تشبیہ سے ''ناگ پھن'' کہتے ہیں۔''

ر	ج	م

(ن) رَجْمًا سنگسار کرنا یعنی پتھر برسانا۔اَلرَّجَامُ پتھر کو کہتے ہیں اس سے اَلرَّجْمُ ہے۔جس کو سنگسار کیا گیا ہو اسے مَرْجُوْمٌ کہتے ہیں۔ پھر استعارہ کے طور پر رَجْمٌ کا لفظ جھوٹے گمان، اندھیرے میں تیر چلانے، تکے مارنے، بدکلامی کرنے اور دھتکارنے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔شیطان کو رَجِیْمٌ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ ملائکہ اعلیٰ کے مراتب سے نکالا گیا۔﴿ وَيَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًۢا بِالْغَيْبِ ۚ ﴾ (18/ الکہف:22) ''اور وہ لوگ کہتے ہیں پانچ ہیں اور چھٹا ان کا کتا ہے۔اندھیرے میں تیر چلاتے ہیں۔''

مَرْجُوْمٌ اِسم المفعول۔جس کو دھتکارا گیا۔سنگسار کیا گیا۔مردود۔﴿ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ ﴾ (26/ الشعراء:116) ''اُن (مغروروں) نے کہا اے نوح! اگر تم باز نہ آئے (تو یاد رکھو) تمہیں ضرور سنگسار کر دیا جائے گا۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)

رَجِیْمٌ فَعِیْلٌ کے وزن میں ہمیشگی کا مفہوم ہوتا ہے اور یہ وزن اسم الفاعل اور اسم المفعول دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ رَجِیْمٌ اسم المفعول ہے یعنی رَجِیْمٌ بمعنی مَرْجُوْمٌ ہے۔سنگسار کیا ہوا۔مردود۔ ہمیشہ کے لیے دھتکارا ہوا۔حضرت مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں ''محاورے میں یہ لفظ اُس شخص کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جسے مقامِ عزت سے گرا دیا گیا ہو اور ذلیل وخوار کر کے رکھ دیا گیا ہو۔'' ﴿ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ۙ ﴾ (15/ الحجر:34) ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا تو نکل جا یہاں سے بے شک تو مردود ہے۔''

رُجُوْمٌ آلاتِ سنگساری۔ یہ رَجْمٌ کی جمع ہے جو مصدر ہے۔اس کا اطلاق اس چیز پر بھی ہوتا ہے جس سے مارا جاتا ہے اسی استعمال کی وجہ سے اس کی جمع رُجُوْمٌ بنی ورنہ مصدر کی جمع نہیں ہوتی۔قرآن مجید میں شُهُبٌ (ستاروں) کو رُجُوْمٌ کہا گیا ہے۔﴿ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ ﴾ (67/ الملک:5) ''اور اُنہیں شاطین کو مار بھگانے کا ذریعہ بنا دیا ہے۔''

ترکیب: اَعُوْذُ ثلاثی مجرد سے واحد متکلم کا صیغہ ہے (فعل + فاعل)۔اَعُوْذُ کے ساتھ عموماً دو صلے استعمال ہوتے ہیں جس کی پناہ طلب کی جائے اُس کے ساتھ ''ب'' کا صلہ آتا ہے اور جس سے پناہ طلب کی جائے اُس کے ساتھ ''مِنْ'' آتا ہے۔اللہ کے ساتھ ''ب'' کا صلہ ہے چنانچہ اللہ کی پناہ طلب کی جارہی ہے اور اَلشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ جو کہ مرکب توصیفی ہے اس سے پہلے مِنْ کا صلہ ہے چنانچہ مردود شیطان سے پناہ طلب کی جارہی ہے۔دونوں مرکب جاری، بِاللّٰهِ اور مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ متعلق ہیں جملہ فعلیہ اَعُوْذُ کے۔

ترجمہ

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ	مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ
میں اللہ کی پناہ میں آتا ہوں	ہمیشہ کے لئے دھتکارے ہوئے شیطان سے

نوٹ۔1 مذکورہ بالا استعاذہ قرآن مجید کا حصہ نہیں ہے۔لیکن سورۃ النحل کی آیت نمبر 98 میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ جب تم قرآن پڑھو تو شیطان سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو۔اس لئے قرآن پڑھتے وقت بسم اللہ سے پہلے استعاذہ پڑھنا ضروری ہے۔

نوٹ۔2 لفظ اللہ کے لیے آگے بسم اللہ دیکھیں۔

تَسْمِيَةٌ

﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ① ﴾

س	م	و

باب	مصدر/اسم	معانی
(ن)	سُمُوًّا	بلند ہونا۔نمایاں ہونا۔عربی میں کہتے ہیں سَمَا اِلَيْهِ بَصَرِیْ۔میری نظر اُس کی طرف اُٹھی یا سَمَوْتُ اِلَيْهِ بِبَصَرِیْ (ب تعدیہ) میں نے اس کی طرف اپنی نظر اٹھائی۔ جب کسی کا نام لیا جاتا ہے تو گویا اس کو بلند و بالا کرتے ہیں تا کہ وہ آنکھوں میں بچ جائے۔
(تفعیل)	تَسْمِيَةً	تَسْمِيَةً، تَفْعِلَةٌ کے وزن پر مصدر ہے۔کسی کو نمایاں کرنا۔کسی کا نام رکھنا۔نام بولنا۔ نام لینا۔﴿ وَ اِنِّیْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ ﴾(3/آل عمران:36)''اور میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے۔''
	سَمِّ	ج:سَمُّوْا۔فعل امر ہے۔تو نام لے۔﴿ قُلْ سَمُّوْهُمْ ط ﴾(13/الرعد:33)''آپؐ کہیے،تم نام لو اُن کے۔''
	مُسَمًّى	باب تفعیل سے اسم المفعول ہے۔جس کا نام لیا گیا ہو۔نام رکھا ہوا۔نمایاں کیا ہوا۔کوئی معین چیز۔﴿ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ط كُلٌّ يَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ط ﴾(13/الرعد:2)''اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کیا۔ ہر ایک رواں ہے ایک معین وقت تک کے لئے۔''
	اِسْمٌ	ج:اَسْمَاءٌ۔کسی چیز کی علامت جو اسے دوسروں سے نمایاں کرے۔نام۔مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اِسْمٌ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:''اسم کا مفہوم عربی میں اردو کے نام سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔اسم وہ ہے جس کے ذریعہ سے کوئی چیز جانی جائے، پہچانی جائے اور یہ شناخت ممکن نہیں جب تک اعراض،خواص،آثار کا علم بھی ساتھ ساتھ نہ ہو۔'' (تفسیر ماجدیؒ،ص ۲۰)
	سَمِیٌّ	ہم نام اور مثل و مشابہ یعنی کسی کی مانند ہونا۔نظیر﴿ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ﴾(19/مریم:65)''کیا تم جانتے ہو اس کا کوئی ہم نام۔''مطلب جو اس نام کا مستحق ہو۔مولانا عبدالماجد دریابادیؒ سَمِیٌّ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:''سَمِیٌّ کے ایک معنی تو یہی''ہم نام'' کے ہیں۔ چنانچہ ائمہ تفسیر نے یہاں بھی یہی مراد لی ہے۔لیکن لغت ہی میں ایک دوسرے سَمِیٌّ ''ہم صفت''، یا مثل،شبیہ و نظیر کا بھی پتہ چلتا ہے اور بعض اکابر لغت و اکابر تفسیر کے نزدیک وہی معنی یہاں ثابت ہیں۔'' (تفسیر ماجدیؒ،ص ۶۵۰)
	سَمَاءٌ	ج: سَمٰوٰتٌ۔ بلندی،آسمان،فضائے آسمانی۔ ہر شے کے بالائی حصے کو سَمَاءٌ کہتے ہیں جیسے اَرْضٌ بول کر ہر چیز کا نچلا حصہ مراد لیتے ہیں جیسے شاعر نے گھوڑے کی صفت میں کہا ہے وَاَحْمَرُ كَالدِّيْبَاجِ اَمَّا سَمَاؤُهٗ فَرُبًّا وَ اَمَّا اَرْضُهٗ فَمَحُوْلُ وہ دیباج کی طرح سرخ ہے،اس کا بالائی حصہ موٹا ہے اور اس کا زیریں حصہ (یعنی ٹانگیں) لاغر اور سخت ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ اسمائے نسبیہ سے ہے کہ ہر سماء اپنے ماتحت کے لحاظ سے سَمَاءٌ ہے لیکن اپنے مافوق کے لحاظ سے اَرْضٌ ہے بجز سماء علیا (فلک الافلاک) کے کہ وہ ہر لحاظ سے سَمَاءٌ ہی ہے اور کسی کے لیے ارض نہیں بنتا۔بادل اور بارش کو بھی سَمَاءٌ کہا جاتا ہے مثلاً﴿ وَ اَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا ص ﴾(6/الانعام:6)''اور ہم نے اُن پر خوب کثرت سے بارش برسائی۔''تفسیر ماجدیؒ کے مطابق السماء یہاں بارش کے معنی میں ہے اور اَرْسَلْنَا برسانے کے معنی میں۔حضرت شیخ

الہندؒ نے یہاں ترجمہ ''آسمان'' سے ہی کیا ہے اور صاحبؒ ضیاء القرآن نے 'بادل' سے ترجمہ کیا ہے۔ صاحبؒ تفسیر ماجدی فرماتے ہیں عربی میں ہر اُس چیز کو سَمَاءٌ کہتے ہیں جو انسان کے اوپر واقع ہو حتیٰ کہ مکان کی چھت کو بھی سَمَاءٌ کہتے ہیں۔ مِنَ السَّمَاءِ کا اطلاق ہر اُس چیز پر ہوتا ہے جو آسمان کی سمت سے نازل ہو۔ (تلخیص)۔ لفظ سَمَاءٌ مذکر مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے مثلاً قرآن مجید میں ہے ﴿ اِلسَّمَآءُ مُنۡفَطِرٌۢ بِہٖ ﴾ (73/المزمل:18) ''اور جس کی سختی سے آسمان پھٹا جارہا ہوگا۔'' (مذکر) اور ﴿ اِذَا السَّمَآءُ انۡفَطَرَتۡ ۙ﴾ (82/الانفطار:1) ''جب آسمان پھٹ جائے گا۔'' (مؤنث)۔ امام راغبؒ کے مطابق لفظ سَمَاءٌ واحد اور جمع دونوں طرح استعمال ہوتا ہے اسی لیے البقرہ: 29 میں ''السماء'' کے لیے ''هُنَّ'' جمع کی ضمیر آئی ہے۔ (واللہ اعلم)

اَجَلٌ مُسَمًّی مقررہ یا متعین مدت۔ ﴿ وَ اَجَلٌ مُّسَمًّی عِنۡدَہٗ ﴾ (6/الانعام:2) ''اور ایک دوسری مدت اور بھی ہے جو اس کے ہاں طے شدہ ہے۔''

ء ل ہ

(ف) اُلُوْهَةً غلامی کرنا۔ عبادت کرنا۔

اِلٰہٌ عبادت کیا ہوا یعنی جس کی عبادت یا غلامی کی گئی۔ معبود۔ اِلٰہٌ، فِعَالٌ کے وزن پر مَاْلُوْہٌ ہے (مَفْعُوْلٌ کا وزن)۔ فِعَالٌ کا وزن اسم المفعول کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جیسے کِتَابٌ یعنی لکھا ہوا یا جس پر لکھا گیا۔ اسی طرح اِلٰہٌ میں مفعول کا مفہوم ہے۔ مطلب جس کی غلامی یا عبادت کی گئی۔ اِلٰہٌ کے تین مفہوم ہیں:

(1) ہر وہ چیز جس کی طرف انسان اپنی تکلیف اور مصیبت کو دور کرنے کے لیے اور اپنی ضروریات پوری کرانے کے لیے رجوع کرے اور جس کو انسان اپنے نفع و نقصان کا مالک سمجھ کر اس کی پرستش کرے خواہ وہ چیز کوئی بت ہو یا کوئی مقام ہو یا آستانہ یا حیوانات یا شجر و حجر یا مظاہر قدرت ہوں، اِلٰہٌ کہلاتا ہے۔

(2) وہ ہستی جس سے انتہائی محبت ہو۔

(3) وہ ہستی جس کا ادراک ممکن نہیں۔ جو ہمارے فہم اور تصور سے ماوراء ہو۔

اِس کی جمع اٰلِہَۃٌ اور مونث اِلٰہَۃٌ ہے۔ اِلٰہَۃٌ کا مطلب دیوی ہے چنانچہ سورج پرست سورج کو (جو کہ عربی میں مؤنث استعمال ہوتا ہے) اِلٰہَۃٌ کہتے ہیں۔ اِلٰہٌ کا لفظ معبود برحق اور معبود باطل دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

اَللّٰہُ لفظ اِلٰہٌ پر لام تعریف داخل کرنے سے قاعدے کے مطابق لفظ اَلْاِلٰہُ بنتا ہے لیکن خلاف قاعدہ مادہ کا ہمزہ گرا کر اَلْ لٰہُ بولتے ہیں اور اس طرح لکھتے ہیں اَللّٰہُ۔ مطلب ہے معبود حقیقی یعنی اصل اِلٰہٌ۔ اللہ کا لفظ خدا تعالیٰ کے لیے بطور اسم ذات استعمال ہوتا ہے۔ یہ کسی خاص صفت کے لیے نہیں بولا جاتا۔ باقی تمام صفات اس کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔ نزول قرآن سے پہلے بھی یہ لفظ خدا تعالیٰ کے لیے بطور اسم ذات استعمال ہوتا تھا۔ اہل عرب نے کبھی اس لفظ کو کسی معبود باطل کے لیے استعمال نہیں کیا۔ اسی لیے قرآن میں اللہ تعالیٰ نے سوال کیا ہے کہ کیا تم اس کے کسی ہمنام کو جانتے ہو۔ ﴿ ہَلۡ تَعۡلَمُ لَہٗ سَمِیًّا ۟﴾ (19/مریم:65) ''کیا تم جانتے ہو اس کا کوئی ہم نام۔'' اللہ کا تثنیہ اور جمع نہیں آتے اور اس پر ''یا'' (حرف ندا) داخل نہیں ہوتا بلکہ یَا حرف ندا کے عوض آخر میں میم مشدّد لگا کر اَللّٰہُمَّ (اے اللہ) استعمال ہوتا ہے۔

ر ح م

(س) رَحْمَۃً، مَرْحَمَۃً، رُحْمًا مہربان ہونا، مہربانی کرنا، رحم دل ہونا، شفقت کرنا۔ ﴿ رَبَّنَا لَا تُزِغۡ قُلُوۡبَنَا بَعۡدَ اِذۡ ہَدَیۡتَنَا وَ ہَبۡ لَنَا مِنۡ لَّدُنۡکَ رَحۡمَۃً ﴾ (3/آل عمران:8) ''پروردگار، جب تو ہمیں سیدھے رستہ پر لگا چکا ہے، تو پھر کہیں ہمارے دلوں کو کجی میں مبتلا نہ کر دیجیو۔ ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا کر۔'' ﴿ وَ تَوَاصَوۡا بِالۡمَرۡحَمَۃِ ﴿ؕ۱۷﴾ ﴾ (90/البلد:17) ''اور (خلق

خدا پر) رحم کرنے کی تلقین کی۔'' ﴿فَاَرَدْنَآ اَنْ یُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَیْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّ اَقْرَبَ رُحْمًا ۝﴾ (18/الکہف:81) ''اس لیے ہم نے چاہا کہ ان کا رب اس کے بدلے ان کو ایسی اولاد دے جو اخلاق میں بھی اس سے بہتر ہو اور جس سے صلۂ رحمی بھی زیادہ متوقع ہو۔''

رَحِمٌ ج: اَرْحَامٌ۔ بچہ دانی، رشتہ داری، قرابت داری۔ رَحِمٌ مجازاً اقرابت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے کیونکہ اہل قرابت ایک ہی رحم سے پیدا ہوتے ہیں۔ اہل قرابت سے اچھے تعلقات قائم رکھنے کو صلۂ رحمی اور ان تعلقات کو خراب کرنے کو قطع رحمی کہتے ہیں۔ احادیث مبارکہ میں صلہ رحمی کے بے شمار فضائل آئے ہیں۔ صاحبؒ تفہیم القرآن ان الفاظ میں اس لفظ کی وضاحت کرتے ہیں ''رحم کا لفظ عربی زبان میں قرابت اور رشتہ داری کے لیے استعارہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ ایک شخص کے تمام رشتہ دار، خواہ وہ دور کے ہوں یا قریب کے، اس کے ذوی الارحام ہیں۔ جس سے جتنا زیادہ قریب کا رشتہ ہو اس کا حق آدمی پر اُتنا ہی زیادہ ہے اور اس سے قطع رحمی کرنا اُتنا ہی بڑا گناہ ہے۔ صلۂ رحمی یہ ہے کہ اپنے رشتہ دار کے ساتھ جو نیکی کرنا بھی آدمی کی استطاعت میں ہو اُس سے دریغ نہ کرے۔ اور قطع رحمی یہ ہے کہ آدمی اس کے ساتھ برا سلوک کرے، یا جو بھلائی کرنا اس کے لیے ممکن ہو اس سے قصداً پہلو تہی کرے۔'' (تفہیم القران، ج۵، ص۲۷) ﴿وَیَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ ؕ﴾ (31/لقمان:34) ''اور وہ جانتا ہے جو بچہ دانیوں میں ہے۔'' ﴿اِنْ تَوَلَّیْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ وَ تُقَطِّعُوْۤا اَرْحَامَكُمْ ۝﴾ (47/محمد:22) ''اگر تم لوگوں کو اقتدار ملے تو تم لوگ حقوق و فرائض کا توازن بگاڑ دو زمین میں اور تم لوگ کاٹ دو اپنی رشتہ داریوں کو۔''

اَلرَّحْمٰنُ اور اَلرَّحِیْمُ یہ دونوں لفظ رَحْمَةٌ سے مشتق ہیں اور دونوں مبالغے کے صیغے ہیں۔ رَحْمَانُ، فَعْلَانُ کے وزن پر ہے جس میں انتہائی شدت اور جوش کا مفہوم پایا جاتا ہے جیسے عَطْشَانُ (انتہائی پیاسا)، غَضْبَانُ (انتہائی غصیلا)، جَوْعَانُ (انتہائی بھوکا)۔ اسی طرح رحمان کا مطلب ہے انتہائی رحمت والا۔ جس کی رحمت میں شدت بھی ہے اور جوش بھی۔ رَحِیْمٌ، فَعِیْلٌ کے وزن پر ہے جس میں کثرت کے ساتھ دوام اور استمرار کا مفہوم ہوتا ہے۔ اس کی جمع رُحَمَاءُ آتی ہے۔ علمائے کرام نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ رحمٰن میں رحیم کی نسبت زیادہ مبالغہ ہے، اس میں رحیم کی نسبت ایک حرف زائد ہے اور عربی میں کہتے ہیں زِیَادَةُ اللَّفْظِ تَدُلُّ عَلٰی زِیَادَةِ الْمَعْنٰی مطلب زائد حرف زیادہ معنی پر دلالت کرتے ہیں۔ چنانچہ رحمٰن اور رحیم کا مطلب ہوا ایسی ہستی جس کی رحمت میں شدت اور جوش بھی ہے اور دوام اور استمرار بھی ہے۔ رحمٰن کا لفظ اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔ جیسے قرآنِ مجید میں فرمایا: ﴿قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ﴾ (17/بنی اسراءیل:110) ''اے نبی ﷺ! ان سے کہو: ''اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر۔'' اس کا تثنیہ اور جمع نہیں آتا۔ رحمٰن وہ ہستی ہے جو اپنی تمام مخلوق پر یکساں مہربانی کرنے والی ہو۔ اور یہ تمام مہربانی صرف اللہ تعالیٰ ہی سے متعلق ہو سکتی ہے۔ چنانچہ رحمان صرف اللہ تعالیٰ ہے کوئی دوسری مخلوق رحمٰن نہیں ہو سکتی۔ جبکہ رحیم کا لفظ اللہ تعالیٰ کے علاوہ دوسروں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں یہ لفظ حضور ﷺ کے لیے اور صحابہؓ کے لیے استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ کے بارے میں فرمایا: ﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْكُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۝﴾ (9/التوبۃ:128) ''دیکھو! تم لوگوں کے پاس ایک رسول ﷺ آیا ہے جو خود تم ہی میں سے ہے، تمہارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق ہے، تمہاری فلاح کا وہ حریص ہے، ایمان لانے والوں کے لیے وہ شفیق اور رحیم ہے۔'' اور صحابہؓ کے بارے میں فرمایا: ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ﴾ (48/الفتح:29) ''محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں (یعنی صحابہؓ) وہ کفار پر سخت ہیں اور آپس میں رحیم ہیں۔'' رحمٰن کے معنی عام الرّحمۃ اور رحیم کے معنی تام الرّحمۃ بھی کیے گئے ہیں۔ لفظ رحمٰن کے بارے میں علمائے عربیت کا اختلاف ہے کہ یہ عربی زبان کا لفظ ہے یا نہیں اور عربی ہونے کی صورت میں یہ مشتق ہے یا غیر مشتق۔ مُبرّد اور ثعلب جو عربیت اور لغت کے امام ہیں وہ اس طرف گئے ہیں کہ یہ عبرانی لفظ ہے اگر اس کو عبرانی لفظ مان لیا جائے تو اس

صورت میں یہ لفظ اللہ کی طرح ذات باری کا اسم علَم ہوگا۔قرآن مجید میں یہ لفظ 57 جگہ مذکور ہے(فوادعبدالباقیؒ)اور بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا استعمال بطور صفت نہیں بلکہ بطور اسم علَم ہوا ہے۔(واللہ اعلم)

ترکیب اِسْمٌ کا مادہ س۔م۔و ہے اور اس کے شروع میں ہمزۃ الوصل ہے۔اس لئے قاعدہ کے لحاظ سے اس کا املا بِاسْمِ اللّٰهِ ہونا چاہئے تھا لیکن صرف بِسْمِ اللّٰهِ کا یہ مخصوص املا ہے کہ اس میں ہمزۃ الوصل لکھا بھی نہیں جاتا،ہمزۃ الوصل ساقط ہونے کے بدلے میں ''ب''لمبی لکھی جاتی ہے۔باقی ہر جگہ قاعدہ کے مطابق لکھا جاتا ہے۔البتہ پڑھا نہیں جاتا مثلاً﴿وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ﴾(5/المائدہ:4)''اور اس پر اللہ کا نام لو۔''الرَّحْمٰن اور الرَّحِيْم کو اگر لفظ اللہ کا بدل مانا جائے تو ترجمہ اس طرح ہوگا''جو انتہائی رحمت والا ہے،جو ہمیشہ رحمت کرنے والا ہے۔''لیکن اگر انہیں صفت مانا جائے تو ترجمہ ہوگا''رحمٰن اور رحیم اللہ کے نام سے''دونوں ترجمے درست مانے جائیں گے۔یہ دونوں حال نہیں ہو سکتے کیونکہ حال نکرہ اور حالت نصب میں ہوتا ہے۔یہ پورا فقرہ مرکب جاری ہے،جملہ نہیں ہے۔اس لئے اس سے قبل کچھ محذوف ماننا ضروری ہے۔اگر اسے جملہ اسمیہ مانا جائے تو اس سے قبل کوئی مبتداء محذوف مانا جائے گا جیسے اِبْتِدَائِيْ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ''میری ابتداء اللہ کے نام سے ہے جو رحمٰن ہے رحیم ہے۔''اگر جملہ فعلیہ مانیں تو اس سے قبل کوئی فعل محذوف مانا جائے گا جیسے اَبْتَدِءُ ''میں ابتداء کرتا ہوں۔''جملہ اسمیہ ہونے کی صورت میں قرآن کریم سے مثال:﴿وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا﴾(11/ھود:41)''نوحؑ نے کہا''سوار ہو جاؤ اس میں،اللہ ہی کے نام سے ہے اس کا چلنا بھی اور اس کا ٹھہرنا بھی۔''(آیت مبارکہ میں مَجْرٖىهَا اور مُرْسٰىهَا مبتداء مؤخر ہیں اور بِسْمِ اللّٰهِ جار مجرور مل کر قائم مقام خبر مقدم ہے)اور جملہ فعلیہ ہونے کی صورت میں مثال:﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۚ﴾(96/العلق:1)''پڑھو!(اے نبیؐ)اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔''(اِقْرَاْ فعل امر ہے اور بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ جار مجرور مل کر متعلق فعل ہیں)۔علامہ زمخشریؒ کی رائے یہ ہے کہ جو کام کر رہے ہوں اس کا فعل محذوف مانیں جیسے اَكْتُبُ''میں لکھتا ہوں۔''اَرْكَبُ''میں سوار ہوتا ہوں۔''

ترجمہ

بِسْمِ اللّٰهِ	الرَّحْمٰنِ	الرَّحِيْمِ
اللہ کے نام سے	جو انتہائی رحمت والا ہے	جو ہمیشہ رحمت کرنے والا ہے

نوٹ: حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ معارف القرآن میں فرماتے ہیں''بِسْمِ اللّٰهِ،یہ کلمہ تین لفظوں سے مرکب ہے ایک حرف باء،دوسرے اسم،تیسرے اللہ،

حرف باء عربی زبان میں بہت سے معنی کے لیے استعمال ہوتا ہے،جن میں سے تین معانی مناسب مقام ہیں،ان میں سے ہر ایک معنی اس جگہ لیے جا سکتے ہیں۔اوّل: مصاحبت،یعنی کسی چیز کا کسی چیز سے متصل ہونا۔دوسرے:استعانت،یعنی کسی چیز سے مدد حاصل کرنا،تیسرے:تبرّک،یعنی کسی چیز سے برکت حاصل کرنا۔

لفظ اِسْمٌ میں لغوی اور علمی تفصیلات بہت ہیں،جن کا جاننا عوام کے لیے ضروری نہیں،اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ اردو میں اس کا ترجمہ نام سے کیا جاتا ہے۔

لفظ اَللّٰهُ،اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سب سے بڑا اور سب سے زیادہ جامع نام ہے،اور بعض علماء نے اسی کو اسم اعظم کہا ہے،اور یہ نام اللہ کے سوا کسی دوسرے کا نہیں ہو سکتا،اس لیے اس لفظ کا تثنیہ اور جمع نہیں آتے،کیونکہ اللہ واحد ہے،اس کا کوئی شریک نہیں،خلاصہ یہ ہے کہ اللہ نام ہے اس موجود حق کا جو تمام صفاتِ کمال کا جامع اور صفاتِ ربوبیت کے ساتھ متصف،یکتا اور بے مثال ہے۔اس لیے کلمۂ بسم اللہ کے معنی حرف باء کے مذکورہ تین معانی کی ترتیب سے یہ ہوئے:اللہ کے نام کے ساتھ،اللہ کے نام کی مدد سے،اللہ کے نام کی برکت سے،لیکن تینوں صورتوں میں یہ ظاہر ہے کہ یہ کلام نامکمل ہے،جب تک اس کام کا ذکر نہ کیا جائے جو اللہ کے نام کے ساتھ یا اس کے نام کی برکت سے کرنا مقصود ہے،اس لیے نحوی قاعدے کے مطابق یہاں کوئی فعل مناسب مقام محذوف ہوتا ہے،مثلاً''شروع کرتا ہوں یا پڑھتا ہوں اللہ کے نام کے ساتھ۔''اور مناسب یہ ہے کہ یہ فعل بھی بعد میں محذوف مانا جائے،تاکہ حقیقۃً شروع اسم اللہ ہی سے ہو،وہ فعل محذوف بھی اسم اللہ سے پہلے نہ آئے،صرف حرف باء کا اسم اللہ سے پہلے آنا عربی زبان کے لحاظ سے ضروری و ناگزیر ہے،اس میں بھی مصحف عثمانی میں باجماع صحابہؓ یہ رعایت رکھی گئی ہے کہ حرف باء رسم الخط کے قاعدے سے الف کے ساتھ ملا کر لکھنا چاہیے تھا اور لفظ اسم الگ،جس کی صورت ہوتی بِاسْمِ اللّٰهِ، لیکن مصحف عثمانی کے رسم الخط میں حرف ہمزہ کو حذف کر کے حرف باء کو سین کے ساتھ ملا کر صورۃً اسم کا جزء بنا دیا،تاکہ شروع اسم اللہ سے ہو جائے،یہی وجہ ہے کہ دوسرے مواقع میں یہ حرف الف حذف نہیں کیا جاتا،جیسے اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ میں ب کو الف کے ساتھ لکھا جاتا ہے،یہ صرف بسم اللہ کی خصوصیت ہے کہ حرف باء کو سین کے ساتھ ملا دیا گیا ہے۔''(معارف القرآن،ج۱،ص:۷۵)

سُوْرَۃٌ

(ج: سُوَرٌ)

جس طرح دنیا کی دوسری کتابیں مختلف ابواب وفصول میں تقسیم ہوتی ہیں اسی طرح قرآن مجید کو بھی مختلف پہلوؤں سے مختلف حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے مثلاً منزلوں، پاروں اور سورتوں وغیرہ میں۔ اِن تقسیمات میں سے سب سے اہم تقسیم سورتوں کی تقسیم ہے۔ یہ تقسیم توقیفی ہے یعنی حضورؐ کے بتانے پر ایسا ہوا ہے۔ سورۃ میں جو ''و'' ہے اسے اصلی یا بدلا ہوا ماننے کی صورت میں مشتقات میں فرق ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اگر ''و'' کو اصلی مانا جائے تو:

(ا) یہ اَلسُّوْرَۃُ سے مشتق ہو گا جس کے معنی ہیں بلند مرتبہ۔ نابغہ کا ایک شعر ہے اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ اَعْطَاکَ سُوْرَۃً ـــــ تَرٰی کُلَّ مَلِکٍ دُوْنَھَا یَتَذَبْذَبُ یعنی بے شک اللہ نے تمہیں ایسا ''بلند مرتبہ'' بخشا ہے جس کے ورے ہر بادشاہ متذبذب نظر آتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی ہر سورۃ اپنے بلند رتبے کی وجہ سے ''سورۃ'' کہلاتی ہے۔

(ب) یا سورۃ کا لفظ سُوْرُ الْمَدِیْنَۃِ سے ماخوذ ہے۔ سُوْرٌ عربی زبان میں اونچی اور بلند دیوار کو کہتے ہیں۔ وہ دیوار جو کسی مکان کی نہیں بلکہ کسی شہر، قلعہ یا احاطہ کے گرد حفاظت کے لیے بنائی گئی ہو اور سُوْرَۃُ الْمَدِیْنَۃِ شہر پناہ کو کہتے ہیں۔ چنانچہ اس معنی کے اعتبار سے قرآن مجید کی ہر سورۃ بھی اپنے مضامین کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

(ج) اگر ''و'' کو اصلی نہ مانا جائے اور بدلا ہوا مانا جائے تو اِس صورت میں یہ سُؤْرَۃٌ (مہموز العین) سے مشتق ہے جس کے معنی کسی شے کے بقیہ اور بچے ہوئے حصے (ٹکڑا) کے ہیں۔ اس معنی کے اعتبار سے سورۃ بھی قرآن مجید کا ایک ٹکڑا اور حصہ ہے۔ اس صورت میں ''و'' کو ''ء'' سے بدلا ہوا مانا جائے گا۔ (واللہ اعلم)

شرع میں قرآنِ مجید کے اس حصے کو ''سورۃ'' کہتے ہیں کہ جس میں کم از کم تین آیتیں ہوں اور اس حصے کا کوئی نام معین بھی ہو جیسے سورہ فاتحہ، بقرہ وغیرہ (حقانیؒ)۔

قرآن مجید میں سورتوں کی جو ترتیب رکھی گئی ہے ان میں سب سے پہلے سورۃ الفاتحہ ہے۔ سورۃ الفاتحہ کے بعد وہ سورتیں ہیں جن کو اَلسَّبْعُ الطِّوَالُ کہا جاتا ہے یعنی ''سات لمبی سورتیں''۔ یہ سات سورتیں مشہور قول کے مطابق مندرجہ ذیل ہیں (1) البقرۃ (2) آل عمران (3) النساء (4) المائدۃ (5) الانعام (6) الاعراف (7) الانفال اور التوبۃ (دونوں ملا کر) واللہ اعلم۔ اس کے بعد وہ سورتیں ہیں جن کی کم وبیش سو سو آیات ہیں۔ یہ سورۂ یونس سے سورہ فاطر تک ہیں۔ اِن کو اصطلاح میں ''مِئِیْن'' کہا جاتا ہے۔ اِن سورتوں کے بعد ''مَثَانِیْ'' ہیں، جن میں مضامین دہرا دہرا کر بیان کیے گئے ہیں۔ یہ سورۂ یٰسٓ سے سورۂ فتح تک ہیں (ایک قول کے مطابق ''مِئِیْن'' میں سے الحج، النور، الفرقان، العنکبوت اور الروم مَثَانِیْ میں سے ہیں۔ واللہ اعلم) پھر قرآن مجید کے آخر میں وہ چھوٹی سورتیں آتی ہیں جن کو مُفَصَّل یا مُفَصَّلَات کہتے ہیں۔ اِن کو مفصّل یا مفصّلات اِس لیے کہتے ہیں کہ یہ سورتیں پورے قرآن مجید کا خلاصہ ہیں۔ اِن مفصّلات میں پھر تقسیم کی گئی ہے۔ حجرات سے نازعات تک، طِوَالُ مُفَصَّلٍ کہلاتی ہیں۔ عبس سے الشّمس تک اَوْسَاطُ مُفَصَّلٍ کہلاتی ہیں اور الضحیٰ سے الناس تک قِصَارُ مُفَصَّلٍ کہلاتی ہیں۔ سورتوں کی یہی ترتیب حضور ﷺ کی ایک حدیث میں بھی بیان ہوئی ہیں جس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ ترتیب خود حضور ﷺ ہی کی اختیار کردہ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے تورات کے بدلے السبع الطوال، زبور کے بدلے مئین اور انجیل کی جگہ مثانی عطا کی گئی ہیں اور جو مجھے بطور فضیلت ملا وہ مفصّل ہیں۔'' (مسند احمد جلد ۴، ص: ۱۰۷)۔ سورتوں کی اس تقسیم کے علاوہ مُسَبِّحَاتٌ ان سورتوں کو کہتے ہیں جن کی ابتداء لفظ سُبْحَانَ، سَبَّحَ، یُسَبِّحُ یا سَبِّحْ سے ہوتی ہیں۔ یہ سات سورتیں ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں: (1) بنی اسرائیل (2) الحدید (3) الحشر (4) الصّف (5) الجمعہ (6) التغابن (7) الاعلیٰ۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ ''قرآن کے مجموعی نظام کا ظاہری پہلو'' کے تحت فرماتے ہیں:

''اگر آپ سورتوں کی اس ترتیب پر ایک نظر ڈالیں، جس ترتیب سے وہ مصحف میں ہیں تو ایک چیز آپ کو بالکل صاف نظر آئے گی کہ قرآن میں مکی اور مدنی سورتوں کے ملے جلے سات گروپ بن گئے ہیں جن میں سے ہر گروپ ایک یا ایک سے زائد مکی سورتوں سے شروع ہوتا ہے اور ایک یا ایک سے زیادہ مدنی سورتوں پر تمام ہوتا ہے۔ ہر گروپ میں پہلے مکی سورتیں ہیں۔ ان کے بعد مدنی سورتیں ہیں۔

پہلا گروپ فاتحہ سے شروع ہوتا ہے، مائدہ پر ختم ہوتا ہے۔ اس گروپ میں فاتحہ مکی ہے باقی چار مدنی ہیں۔

دوسرا گروپ انعام اور اعراف دو مکی سورتوں سے شروع ہوتا ہے اور انفال و توبہ دو مدنی سورتوں پر ختم ہوتا ہے۔

تیسرے گروپ میں پہلے 14 سورتیں یونس تا مومنون مکی ہیں۔ آخر میں سورہ نور ہے جو مدنی ہے۔ اس گروپ کی دو سورتوں رعد اور حج کو بعض لوگوں نے مدنیات میں شمار کیا ہے لیکن یہ خیال غلط ہے۔ اس مسئلے پر ہم مذکورہ سورتوں کی تفسیر میں بحث کریں گے۔

چوتھا گروپ فرقان سے شروع ہوتا ہے، احزاب پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں 8 سورتیں مکی ہیں۔ آخر میں ایک احزاب مدنی ہے۔

پانچواں گروپ سبا سے شروع ہوتا ہے، حجرات پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں 13 سورتیں مکی ہیں۔ آخری تین مدنی ہیں۔

چھٹا گروپ ق سے شروع ہو کر تحریم پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں پہلے سات مکی ہیں اس کے بعد دس مدنی۔ اس گروپ میں بعض لوگوں نے سورۂ رحمان کو مدنی قرار دیا ہے لیکن ہم سورہ کی تفسیر میں واضح کریں گے کہ یہ خیال بے بنیاد ہے۔

ساتواں گروپ ملک سے شروع ہو کر الناس پر ختم ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک اس میں بھی مکیات اور مدنیات کی ترتیب اسی طرح ہے جس طرح دوسرے گروپوں میں ہے لیکن اس کی سورہ دہر اور آخری بعض سورتوں کے بارے میں چونکہ اختلافات ہیں اس وجہ سے ان پر بھی ہم ان سورتوں کی تفسیر ہی میں بحث کریں گے۔

سورتوں کی یہ ترتیب، ہر صاحب علم جانتا ہے کہ اتفاقی نہیں بلکہ توقیفی ہے۔ یہ وہ ترتیب ہے جس ترتیب پر قرآن لوح محفوظ میں ہے۔ یہی ترتیب ہے جس پر نبی ﷺ اور حضرت جبریل امین، جیسا کہ حدیثوں سے ثابت ہے، ہر رمضان میں قرآن مجید کا مذاکرہ فرماتے تھے۔ اسی ترتیب کے مطابق صحابہ رضی اللہ عنہم بھی رمضان میں قرآن مجید سنتے سناتے تھے۔ اور اسی ترتیب کے مطابق سیدنا عثمان غنیؓ نے مصحف کی نقلیں تمام ممالک اسلامیہ میں بھجوائیں۔ اس وجہ سے یہ ترتیب حکمت سے خالی نہیں ہو سکتی۔'' (تدبر قرآن، ج ۱، ص: ۲۵)

اٰیَۃٌ

(ج: اٰیَاتٌ)

مولانا مودودیؒ لفظ آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آیت کے اصل معنی اس نشانی یا علامت کے ہیں جو کسی چیز کی طرف رہنمائی کرے۔ قرآن میں یہ لفظ چار مختلف معنوں میں آیا ہے۔

(1) کہیں اس سے مراد محض علامت یا نشانی ہی ہے۔

(2) کہیں آثارِ کائنات کو اللہ کی آیات کہا گیا ہے، کیونکہ مظاہر قدرت میں سے ہر چیز اُس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو اس ظاہری پردے کے پیچھے مستور ہے۔

(3) کہیں ان معجزات کو آیات کہا گیا ہے جو انبیاء علیہم السلام لے کر آتے تھے، کیونکہ یہ معجزے دراصل اس بات کی علامت ہوتے تھے کہ یہ لوگ فرمانروائے کائنات کے نمائندے ہیں۔

(4) کہیں کتاب اللہ کے فقروں کو آیات کہا گیا ہے، کیونکہ وہ نہ صرف حق اور صداقت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، بلکہ فی الحقیقت اللہ کی طرف سے جو کتاب بھی آتی ہے، اس کے محض مضامین ہی میں نہیں، اس کے الفاظ اور اندازِ بیان اور طرزِ عبارت تک میں اس کے جلیل القدر مصنف کی شخصیت کے آثار نمایاں طور پر محسوس ہوتے ہیں۔

ہر جگہ عبارت کے سیاق وسباق سے بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ کہاں ''آیت'' کا لفظ کس معنی میں آیا ہے۔ (تفہیم القرآن، ج ۱، ص: ۶۹)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ الفاتحۃ

آیت:1-2

﴿ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۙ﴿۱﴾ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۙ﴿۲﴾ ﴾

ح م د

(باب)	مصدر/اسم	معانی
(س)	حَمْدًا	محسن کی تعریف کرنا۔اُس کے فضائل بیان کرنا بشرطیکہ وہ افعال اختیاری ہوں۔(نوٹ: حمد کی مزید تفصیل آگے نوٹ میں دیکھیں)۔
	حَامِدٌ	ج: حَامِدُوْنَ- اسم الفاعل ہے۔حمد کرنے والا۔﴿ اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ ﴾(9/التوبۃ:112)''توبہ کرنے والے،عبادت کرنے والے،حمد کرنے والے۔''
	مَحْمُوْدٌ	اسم المفعول ہے۔حمد کیا ہوا یعنی جس کی تعریف کی گئی۔﴿ عَسٰۤی اَنۡ یَّبۡعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا ﴿۷۹﴾ ﴾(17/بنی اسرائیل:79)''قریب ہے کہ آپ ﷺ کو پہنچادے،آپ ﷺ کا رب،حمد کئے ہوئے مقام پر۔''
(تفعیل)	تَحْمِیْدًا	محسن کی کثرت سے حمد کرنا۔
	مُحَمَّدٌ	اسم المفعول ہے۔اَلْمُحَمَّدُ هُوَ الَّذِیْ حُمِدَ مَرَّةً بَعْدَ مَرَّةٍ۔محمد وہ ہے جس کی بار بار تعریف کی گئی ہو۔کثرت سے حمد کیا ہوا۔حضور ﷺ کا نام مبارک۔امام راغبؒ فرماتے ہیں''جس کی تعریف کی جائے اُسے محمود کہا جاتا ہے۔مگر مُحَمَّدٌ صرف اسی کو کہہ سکتے ہیں جو بکثرت قابل ستائش خصلتیں رکھتا ہو۔''﴿ مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰہِ ؕ ﴾(48/الفتح:29)''محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔''(نوٹ: محمد کی مزید تفصیل آگے نوٹ میں دیکھیں)
	اَحْمَدُ	افعل تفضیل ہے۔دوسروں کی بنسبت زیادہ(تفضیل بعض) یا سب سے زیادہ(تفضیل کل) حمد کرنے والا۔حضور ﷺ کا نام مبارک۔جب حضور ﷺ کے لیے یہ نام استعمال ہو تو معنی ہوتے ہیں اَحْمَدُ الْحَامِدِیْنَ لِرَبِّهٖ یعنی تمام حمد کرنے والوں سے بڑھ کر اپنے رب کی حمد کرنے والا۔﴿ وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوۡلٍ یَّاۡتِیۡ مِنۡۢ بَعۡدِی اسۡمُهٗۤ اَحۡمَدُ ؕ ﴾(61/الصّف:6)''اور بشارت دینے والا ایک رسول کی،وہ آئیں گے میرے بعد،ان کا نام احمد ہوگا۔''
	حَمِیْدٌ	فَعِیْلٌ کا وزن اسم المفعول کے معنی میں یعنی مَحْمُوْدٌ۔ہمیشہ ہمیشہ سے حمد کیا ہوا۔وہ ذات جو حمد کی مستحق ہے کوئی حمد کرے یا نہ کرے۔مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں''حمید کا لفظ اگرچہ محمود ہی کا ہم معنی ہے،مگر دونوں لفظوں میں ایک لطیف فرق ہے۔محمود کسی شخص کو اُسی وقت کہیں گے جبکہ اس کی تعریف کی گئی ہو یا کی جاتی ہو۔مگر حمید آپ سے حمد کا مستحق ہے،خواہ کوئی اس کی حمد کرے یا نہ کرے۔''(تفہیم القرآن،جلد2،صفحہ469)﴿ اَنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ حَمِیۡدٌ ﴿۲۶۷﴾ ﴾(2/البقرہ:267)''بیشک اللہ تعالیٰ غنی ہے حمید ہے۔''

نوٹ: حَمْدٌ

حمد کہتے ہیں کسی کے اوصاف حمیدہ اور فضائل کے بیان کرنے کو بشرطیکہ وہ افعال اختیاری ہوں۔حمد کا مفہوم سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ عربی ہی کے دو اور الفاظ''مدح''اور''شکر''کے مفہوم کو پہلے سمجھا جائے۔حمد، مدح سے خاص اور شکر سے عام اور زیادہ وسیع ہے۔اس کی تفصیل کچھ اس طرح سے ہے۔مدح (تعریف کرنا) ان افعال پر بھی ہوتی ہے جو انسان اختیاری طور پر کرتا ہے اور ان خوبیوں پر بھی جو انسان میں پیدائشی طور پر موجود ہوں جن پر اس کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔اگر کوئی شخص سخی ہے اور سخاوت کرتا ہے تو یہ اس کا اختیاری فعل ہے چنانچہ اس پر جو تعریف کی جائے گی وہ مدح بھی ہے اور

حمد بھی۔ اگر یہی شخص خوبصورت ہے اور دراز قامت بھی تو اس پر بھی اس کی تعریف کی جائے گی لیکن یہ تعریف مدح کہلائے گی حمد نہیں کیونکہ حمد اختیاری افعال پر ہوتی ہے۔ چنانچہ ''ہر حمد تو مدح ہے لیکن ہر مدح، حمد نہیں'' (مفردات)۔ لہٰذا جیسے پہلے عرض کیا کہ ''حمد، مدح سے خاص ہے۔'' اللہ تعالیٰ کے لیے مدح کا لفظ غیر موزوں ہے کیونکہ اللہ کے سب افعال پسندیدہ بھی ہیں اور اختیاری بھی اور مدح کا لفظ قرآن مجید میں کہیں نہیں آیا۔ حمد کا لفظ صرف اچھی صفتیں بیان کرنے پر بولا جاتا ہے۔ اگر کسی کی بری صفات بیان کی جائیں گی تو حمد نہ ہوگی۔ شکر کسی کے احسانات وانعامات کی وجہ سے اس کی تعریف کو کہتے ہیں۔ اس کی ضد کفر ہے۔ کوئی چیز جتنی عیب ونقص سے پاک ہوگی اس کی اتنی ہی تعریف کی جائے گی اور اگر یہ احساس پیدا ہو جائے کہ وہ چیز ہمارے فائدے کے لیے ہے تو جو جذبہ پیدا ہوگا وہ شکر ہے اس شکر کے جذبے کے ساتھ جو تعریف کی جائے گی وہ حمد ہے۔ مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھوک میں کھلاتا ہے اور پیاس میں پلاتا ہے تو ان نعمتوں کا احساس اور اظہار شکر ہے۔ اور اس شکر کے جذبے سے اللہ تعالیٰ کی جو تعریف کی جائے گی وہ حمد ہے۔ لیکن اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ اس کائنات کا نظام کس خوبی سے چلا رہا ہے تو یہ صرف ''حمد'' ہوگی۔ اس لیے شروع میں عرض کیا کہ حمد، شکر سے زیادہ وسیع مفہوم رکھتی ہے۔ لہٰذا ''ہر شکر تو حمد ہے مگر ہر حمد، شکر نہیں'' (مفردات)۔ شکر اور حمد کے باہمی تعلق پر مولانا امین احسن اصلاحیؒ فرماتے ہیں: ''استعمالات کے لحاظ سے اگرچہ حَمْد کا لفظ شکر کے مقابل میں زیادہ وسیع ہے، شکر کا لفظ صرف انہی خوبیوں اور انہی کمالات کے اعتراف کے موقع پر بولا جاتا ہے جن کا فیض آدمی کو خود پہنچ رہا ہو، برعکس اس کے ''حمد'' ہر قسم کی خوبیوں اور ہر قسم کے کمالات کے اعتراف کے لیے عام ہے خواہ اُن کا کوئی فیض خود حمد کرنے والے کی ذات کو پہنچ رہا ہو یا نہ پہنچ رہا ہو، تاہم شکر کا مفہوم اِس لفظ کا جزوِ غالب ہے۔ اِس وجہ سے اس کے ترجمہ کا پورا پورا حق ادا کرنے کے لیے یا تو تعریف کے لفظ کے ساتھ ''شکر'' کا لفظ بھی ملانا ہوگا یا پھر شکر ہی کے لفظ سے اُس کی تعبیر کرنا زیادہ مناسب رہے گا۔'' (تدبر قرآن، ج ۱، ص ۵۶)۔ ''قرآن مجید میں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کے استعمالات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ عموماً شکر ادا کرنے کے لیے آیا ہے، مثلاً ﴿وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا﴾ (7/الاعراف:43) ''انہوں نے کہا، شکر کا سزاوار ہے اللہ جس نے ہمیں ہدایت بخشی۔'' اور ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ﴾ (14/ابراہیم:39) ''شکر ہے اللہ کے لیے جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیلؑ اور اسحاقؑ عطا فرمائے۔'' شاہ عبدالقادرؒ، ڈپٹی نذیر احمدؒ، مولانا فتح محمدؒ اور شیخ الہندؒ نے یہاں 'اَلْحَمْدُ' کا ترجمہ 'شکر' کیا ہے۔ مولانا تھانویؒ نے سورۂ فاتحہ کے حاشیہ میں لکھا ہے ''عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الشُّكْرُ لِلّٰهِ'' (ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کے معنی ہیں، شکر اللہ کے لیے) امام ابن جریر طبریؒ فرماتے ہیں ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' کے معنی ہیں شکر خالص اللہ جل ثناءہ کے لیے.....'' (تفسیر طبری جلد اول) امام رازیؒ کا ارشاد ہے ''حمد نعمتوں پر ہوتی ہے۔'' (تفسیر کبیر، جلد اول۔ بحوالہ فی ظلال القرآن، جلد اول، صفحہ 70)

نوٹ: مُحَمَّدٌ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں: ''مُحَمَّدٌ، لفظی معنی ہیں وہ شخص جس کی مدح بہت یا بار بار کی جائے یا جو صفات حسنہ کا مجموعہ ہو۔ یُقَالُ فُلَانٌ مُحَمَّدٌ اِذَا كَثُرَتْ خِصَالُهُ الْمَحْمُوْدَةُ (راغبؒ)۔ اسم علم ہے، ہمارے رسول ﷺ اور دنیا کے آخری نبی کا۔ حضور ﷺ کی بعثت سے قبل اس نام کا رواج بہت کم تھا۔ علامہ ابوجعفر محمد بن حبیب بغدادی المتوفی ۲۴۵ھ نے کل سات آدمی اس نام کے گنائے ہیں (کتاب المعتبر صفحہ 130) اور ان میں سے ایک محمد بن سفیان بن مجاشع کی بابت تو یہ کہا ہے کہ اُن کے والد نے ایک شامی راہب سے یہی سن کر کہ آئندہ پیمبر کا نام محمد ہوگا اپنے لڑکے کا یہی نام رکھ دیا۔'' (بحوالہ تفسیر ماجدیؒ صفحہ 191)

ترکیب الحمد میں ''ال'' استغراق کا ہے یعنی اشارہ جنسِ اسم اور اس کی تمام قسموں کی طرف ہے یعنی حمد کی جتنی بھی صورتیں ممکن ہیں وہ سب اِس لفظ میں شامل ہیں اِس لیے الحمد کا ترجمہ ہوگا تمام حمد۔ اُردو زبان میں حمد کا مفہوم ادا کرنے کے لیے کوئی مناسب لفظ نہیں ہے اِس لیے بہتر ہے کہ حمد کا ترجمہ حمد ہی سے کیا جائے البتہ ہمارے بزرگوں نے ہمیں اِس لفظ کا مفہوم سمجھانے کے لیے اُردو زبان میں اِس لفظ سے قریب ترین الفاظ کے ساتھ ترجمہ کیا ہے مثلاً ''سب تعریفیں''، ''ساری تعریف''، ''شکر کا سزاوار''۔ اَلْحَمْدُ مبتداء ہے اس کی خبر ثَابِتٌ (ثابت ہے) یا وَاجِبٌ (واجب ہے) محذوف ہے۔ لِلّٰهِ مرکب جاری ہے اور قائم مقام خبر ہے۔

ترجمہ	اَلْحَمْدُ	لِلّٰهِ
	تمام حمد	اللہ کے لئے ہے

نوٹ:1 قرآن مجید میں سورتوں کے نام مرکب اضافی کی ترکیب میں لکھے ہیں۔چنانچہ سُوْرَۃُ الْفَاتِحَۃِ بھی مرکب اضافی ہے۔فَتَحَ سے اسم الفاعل واحد مونث فَاتِحَۃٌ بنتا ہے۔اس لئے اس کا لفظی ترجمہ ہوگا ''کھولنے والی کی سورۃ''لیکن اردو محاورہ کے لحاظ سے ہم کہیں گے''کھولنے والی سورۃ۔''

نوٹ:2 الف لام کی اقسام:الف لام کی دو قسمیں ہیں:(1)اسمی (2)حرفی

(1)الف لام اسمی: الف لام اسمی وہ ہے جو اسم فاعل اور اسم مفعول پر داخل ہوتا ہے اور یہ اَلَّذِیْ اسم موصول کے معنی میں ہوتا ہے اور اس کا صلہ وہ اسم فاعل اور اسم مفعول ہوتا ہے جس پر وہ داخل ہوتا ہے۔مثلاً ضَارِبٌ اسم الفاعل ہے اس پر'ال' داخل کریں گے تو اَلضَّارِبُ بنتا ہے اور یہ'ال'،اَلَّذِیْ کے معنوں میں ہے چنانچہ مطلب ہوگا اَلَّذِیْ یَضْرِبُ۔وہ جو مارتا ہے/ مارے گا۔مَضْرُوْبٌ اسم المفعول ہے اس پر'ال' داخل کریں گے تو اَلْمَضْرُوْبُ بنتا ہے اور یہ'ال'،اَلَّذِیْ کے معنوں میں ہے چنانچہ مطلب ہوگا اَلَّذِیْ یُضْرَبُ وہ جسے مارا جاتا ہے/ مارا جائے گا۔قرآن مجید کی سورۂ مائدۃ آیت 38 میں فرمایا وَ السَّارِقُ وَ السَّارِقَۃُ فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَھُمَا یہاں السَّارِقُ کا مطلب ہے اَلَّذِیْ یَسْرِقُ اور السَّارِقَۃُ کا مطلب ہے اَلَّتِیْ تَسْرِقُ۔

(2) الف لام حرفی: الف لام حرفی وہ ہوتا ہے جو اسم فاعل اور اسم مفعول کے علاوہ کسی اور اسم پر داخل ہو۔

الف لام حرفی کی پھر دو قسمیں ہیں (ا) زائدہ (ب) غیر زائدہ۔

زائدہ کی تعریف: الف لام حرفی زائدہ وہ ہوتا ہے جس کے گرانے سے معنی فاسد نہ ہو یا بعنوان دیگر جس کے آنے کا فائدہ نہ ہو اور جانے کا نقصان نہ ہو۔

غیر زائدہ کی تعریف:الف لام غیر زائدہ وہ ہوتا ہے جس کے آنے کا فائدہ ہو اور جانے کا نقصان ہو۔

پھر غیر زائدہ کی چار قسمیں ہیں:(۱)جنسی (۲)استغراقی (۳)عہد خارجی (۴)عہد ذہنی۔

الف لام کے مدخول (یعنی جس لفظ پر'ال' داخل ہو) سے ماہیت (یعنی حقیقت، کیفیت) مراد ہوگی یا افراد، اگر ماہیت مراد ہو تو یہ الف لام جنسی ہوگا جیسے اَلرَّجُلُ خَیْرٌ مِّنَ الْمَرْاَۃِ (جنس مرد بہتر ہے جنس عورت سے) یہاں یہ معنی نہیں کہ افراد رجل، افراد مرأۃ سے بہتر ہیں۔کیونکہ بہت سے افراد عورتوں کے مردوں کے افراد سے بہتر ہوتے ہیں جیسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا وغیرہ۔اگر افراد مراد ہوں تو دو حال سے خالی نہیں تمام افراد مراد ہوں گے یا بعض، اگر تمام افراد مراد ہوں تو اس کو استغراقی کہتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ (بے شک تمام انسان خسارے میں ہیں)۔یہاں پر الف لام جو انسان پر داخل ہے استغراقی ہے یعنی اشارہ جنسِ انسان کے تمام افراد، مرد ہوں یا عورت، سب کی طرف ہے۔اگر الف لام کے مدخول سے بعض افراد مراد ہیں تو پھر یہ دو حال سے خالی نہ ہوگا وہ بعض افراد خارج میں متعین ہوں گے یا غیر متعین۔اگر متعین ہوں تو اس کو الف لام عہد خارجی کہتے ہیں اور اگر غیر متعین ہوں تو اس کو الف لام عہد ذہنی کہتے ہیں اول کی مثال اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَعَصٰی فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ (پس فرعون نے رسول کی نافرمانی کی) اس مثال میں الرَّسُوْلَ سے مراد وہ متعین رسول ہیں جس کا ذکر پہلے اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَیْکُمْ رَسُوْلًا شَاھِدًا عَلَیْکُمْ کَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ۝ میں آچکا ہے یعنی حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام مراد ہیں۔ثانی کی مثال، وَ اَخَافُ اَنْ یَّاْکُلَہُ الذِّئْبُ (پس مجھے خوف ہے کہ کھا جائے گا اس کو بھیڑیا)۔یہاں ذئب سے خارج میں کوئی متعین بھیڑیا مراد نہیں بلکہ کوئی بھیڑیا مراد ہے۔

فائدہ:(1) الف لام عہد ذہنی کا مدخول نکرہ کے حکم میں ہوتا ہے معرفہ نہیں ہوتا۔اسی وجہ سے اس کو مبتدا بنانا بھی درست نہ ہوگا۔

فائدہ:(2) جو 'ال' اسم عَلَم پر داخل ہو وہ زائد ہوتا ہے کیونکہ اسم علم خود ہی معرفہ ہے۔لیکن ہر ایک اسم علم پر'ال' نہیں لگایا جا سکتا ہے۔اہل زبان نے جہاں لگایا ہے وہیں لگے گا:الحسن، الخلیل، الفضل، العباس، النُّعمَان، الحارث کہہ سکتے ہیں۔کیونکہ اہل زبان سے ایسا سنا گیا ہے مگر المحمود نہیں کہا جاتا۔

اکثر ملکوں کے نام پر'ال' زائدہ لگایا جاتا ہے:الشّام، الرّوم، الھند، الباکستان، العرب، الیمن، الفرنسا وغیرہ لیکن شہروں کے نام پر بہت کم'ال' آتا ہے۔مکۃ، مصر، بَغْدَادُ، لاھور وغیرہ پر'ال' داخل نہیں ہوتا۔البتہ المدینہ پر'ال' لگایا جاتا ہے کیونکہ مَدِیْنَۃٌ تو ہر ایک بڑے شہر کو کہہ سکتے ہیں۔اسی طرح القاہرۃ پر بھی لام تعریف داخل ہوتا ہے۔

نوٹ:3 اوپر بات ہوئی ہے کہ اَلْحَمْدُ کی خبر محذوف ہے۔اس ضمن میں بات سمجھ لیں کہ ہر زبان میں کسی جملے میں سے کچھ الفاظ حذف کر دینے کا رواج ہے مثلاً گھر کی گھنٹی بجے تو ہم کہتے ہیں ''کون ہے؟''۔ یہاں لفظ ''آیا'' محذوف ہے۔ پورا جملہ ہے ''کون آیا ہے؟'' کسی کو جاتا دیکھ کر ہم کہتے ہیں کہاں؟ اس میں الفاظ ''جا رہے ہو'' محذوف ہے۔اسی طرح عربی میں بھی اور قرآن مجید میں بھی محذوفات ملیں گے۔لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جہاں جی چاہے اور جو جی چاہے محذوف مان لیا جائے۔محذوفات کا فیصلہ زبان کے محاورہ اور جملہ کے سیاق وسباق کے پیش نظر کیا جاتا ہے۔

نوٹ۔4 عربی میں مرکب جاری اور ظرف، جملہ اسمیہ میں متعلق خبر بن کر آتے ہیں یعنی خبر کی وضاحت اور تشریح کرتے ہیں لیکن خود خبر نہیں بنتے۔ جملہ میں خبر اگر محذوف ہو تو پھر یہ قائم مقام خبر کہلاتے ہیں۔مثلاً اَلرَّجُلُ مَوْجُوْدٌ فِی الْبَیْتِ میں فِی الْبَیْتِ متعلق خبر ہے۔اور اَلرَّجُلُ فِی الْبَیْتِ میں فِی الْبَیْتِ قائم مقام خبر ہے۔

ر ب ب

(ن) رَبًّا اس لفظ میں دو مفہوم پائے جاتے ہیں:(1) مالک ہونا۔(2) تربیت کرنا، پرورش کرنا۔صاحبؒ ضیاء القرآن فرماتے ہیں ''رب مصدر ہے اس کا معنی ہے تربیت اور تربیت عربی میں کہتے ہیں تَبْلِیْغُ الشَّیْءِ اِلٰی کَمَالِہٖ بِحَسْبِ اِسْتِعْدَادِہِ الْاَزَلِیْ شَیْئًا فَشَیْئًا (روح المعانی) کسی چیز کو اس کی ازلی استعداد وفطری صلاحیت کے مطابق آہستہ آہستہ مرتبۂ کمال تک پہنچانا۔'' (ضیاء القرآن، ج۱،ص ۲۲)۔امام راغبؒ فرماتے ہیں: '' ھُوَ اِنْشَاءُ الشَّیْءَ حَالًا فَحَالًا اِلٰی حَدِّ التَّمَامِ یعنی کسی چیز کو یکے بعد دیگرے ایک حالت سے دوسری حالت میں اس طرح نشوونما دیتے رہنا کہ حدِ کمال تک پہنچ جائے۔'' (بحوالہ لغات القرآن، ج۳،ص ۴۵)

رَبٌّ ج: اَرْبَابٌ ۔تربیت کرنے والا، پرورش کرنے والا، پالنے والا، پروردگار۔(یہ مصدر ہے لیکن بطور اسم الفاعل بھی استعمال ہوتا ہے)۔کسی چیز کو آہستہ آہستہ درجۂ کمال تک پہنچانے والا اور اُس کی تمام ضروریات کا خیال رکھنے والا۔اِس تربیت میں محبت، حفاظت اور نگہداشت کا عنصر موجود ہوتا ہے جیسے ماں باپ کا بچے کو پالنا۔رَبٌّ اضافت اور لام تعریف کے بغیر ہو تو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔اضافت کے ساتھ اللہ اور دوسروں پر بھی بولا جاتا ہے اور اس صورت میں عام طور پر ''مالک، آقا'' کے معنی دیتا ہے۔جیسے رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (تمام جہانوں کا پالنے والا یا تمام جہانوں کا مالک) اور رَبُّ الدَّارِ (گھر کا مالک)۔قرآن مجید میں آتا ہے ﴿قَالَ مَعَاذَ اللّٰہِ اِنَّہٗ رَبِّیْٓ اَحْسَنَ مَثْوَایَ ط﴾ (12/یوسف:23) ''یوسفؑ (پاکباز) نے فرمایا خدا کی پناہ! (یوں نہیں ہوسکتا) وہ (تیرا خاوند) میرا محسن ہے۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن) اس آیت کے تحت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں: ''اِنَّہٗ میں ضمیر زلیخا کے شوہر عزیز مصر کی جانب ہے۔ رَبِّیْٓ ۔ لفظ رب ظاہر ہے کہ یہاں خالق و پروردگار کے معنی میں نہیں دنیوی مالک اور آقائے مجازی کے معنی ہی میں ہے۔'' اور فرمایا: ﴿وَقَالَ لِلَّذِیْ ظَنَّ اَنَّہٗ نَاجٍ مِّنْھُمَا اذْکُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّکَ ز فَاَنْسٰہُ الشَّیْطٰنُ ذِکْرَ رَبِّہٖ﴾ (12/یوسف:42) ''اور کہا یوسفؑ نے اُسے جس کے بارے میں اُن کو یقین تھا کہ وہ نجات پا جائے گا اُن دونوں میں سے کہ اپنے آقا سے میرا ذکر کرنا۔مگر شیطان نے اسے ایسا غفلت میں ڈالا کہ وہ اپنے آقا سے اس کا ذکر کرنا بھول گیا۔'' اس آیت کی تفسیر میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں ''عِنْدَ رَبِّکَ یعنی اپنے آقا بادشاہ ملک سے..... بعض جدید اہل قلم نے بادشاہ کے لیے ایک پیمبر کی زبان سے لفظ رب کے ادا ہونے پر بڑی حیرت کا اظہار کیا ہے۔حالانکہ جب لفظ کے کھلے ہوئے معنی علاوہ خالق پروردگار کے آقا و مالک کے بھی موجود ہیں تو اس کے استعمال پر یہ اظہار حیرت خود حیرت انگیز ہے۔پیغمبرؑ حقائق کے ترجمان ہوتے ہیں ان کی زبان آجکل کے اخبار نویسوں، پرجوش خطیبوں اور سیاسی لیڈروں کی زبان نہیں ہوتی۔مالک وآقا کی تعبیر لفظ رب سے کرنا زبان عرب میں عام ہے۔''

رَبَّانِيٌّ ج: رَبَّانِيُّوْنَ۔اسم نسبت ہے۔رب والا۔اللہ والا۔رَبَّانِيٌّ میں 'الف' اور 'ن' کا اضافہ مبالغے کے لیے ہے یعنی بالکل اللہ والا۔پیر کرم شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:''رَبَّانِيٌّ، رب کی طرف منسوب ہے اس نسبت کی وجہ سے اسے رَبِّيٌّ ہونا چاہیے تھا۔لیکن بسا اوقات مبالغہ کے لیے الف نون کا اضافہ کر دیا کرتے ہیں۔مثلاً (لِحْيَةٌ بمعنی داڑھی سے) جس کی بڑی گھنی داڑھی ہو اُسے باضافہ الف نون لِحْيَانِيٌّ اور (رَقَبَةٌ بمعنی گردن سے) جس کی گردن بہت فربہ ہو اُسے باضافہ الف نون رَقَبَانِيٌّ کہا جاتا ہے۔اس صورت میں اس کا معنی ہوگا بالکل اللہ والا۔مبرد نے اس کا ایک دوسرا ماخذ بتایا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ یہ ربّان کی جمع ہے جو رَبَّہٗ یَرُبُّہٗ فَھُوَ رَبَّانٌ سے ماخوذ ہے۔اس کا معنی ہے تربیت نفوس، اِصلاح احوال اور تدبیر اُمور کرنے والا۔اب رَبَّانِيٌّ کا معنی ہوگا نوعِ انسانی کی صحیح تربیت اور ان کی اِصلاح کرنے والا۔''(ضیاء القرآن، ج ا،ص ۷ ۲۴ تلخیصاً) ﴿لَوْ لَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ﴾ (5/المائدہ:63)''کیوں نہیں منع کرتے ان کو اللہ والے لوگ۔''

رِبِّيُّوْنَ اس کی واحد رِبِّيٌّ ہے۔مراد ہے اللہ والے یا جماعتیں۔حضرت مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں:''ربّ کی طرف منسوب ہے جیسے رَبَّانِيٌّ، معنی ہیں رب والے۔اس میں حرف را مفتوح کی بجائے مکسور خلاف قیاس ہوا ہے (روح)۔بعض حضرات نے اس کے معنی بہت سی جماعتوں کے کیے ہیں ان کے نزدیک یہ رِبَّۃٌ بکسر را بمعنی الجماعۃ کی طرف منسوب ہے۔'' (معارف القرآن، جلد2، صفحہ 200)۔اور پیر کرم شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:''رِبِّيُّوْنَ کی را پر تینوں حرکتیں آسکتی ہیں۔زمخشری نے تو اس کا معنی رب والے ہی کیا ہے۔اَلرِّبِّيُّوْنَ: اَلرَّبَّانِيُّوْنَ (کشاف)۔لیکن علامہ قرطبیؒ نے اس کا دُوسرا معنی انبوہِ کثیر بھی لکھا ہے اَلرِّبِّيُّوْنَ: اَلْجَمَاعَۃُ الْكَثِيْرَۃُ۔ اِس صورت میں اس کا واحد رُبِّيٌّ ہے اور رِبَّۃٌ بمعنی جماعت کی طرف منسوب ہے۔(ضیاء القرآن، جلد 1، صفحہ:281)۔﴿وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ﴾(3/آل عمران:146)''اور کتنے ہی نبی گزرے ہیں کہ جہاد کیا ان کے ہمراہ بہت سے اللہ والوں نے۔''(ترجمہ ضیاء القرآن)

رَبِيْبَةٌ ج:رَبَائِبُ۔ زیر تربیت سوتیلی بیٹی۔﴿وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ﴾(4/النساء:23)''اور تمہاری سوتیلی بیٹیاں جو تمہاری گودوں میں ہیں۔''

رُبَمَا یہ حرف جر 'رُبَّ' اور 'مَا' کافہ سے مرکب ہے۔حرف جر رُبَّ، تشدید اور تخفیف (رُبَ) دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔رُبَّ اسم پر داخل ہوتا ہے اور رُبَمَا فعل پر بھی داخل ہو جاتا ہے۔سیاق کلام کے مطابق رُبَمَا کسی چیز کی کثرت یا قلت کو ظاہر کرتا ہے۔یعنی تکثیر کے اعتبار سے اس کا ترجمہ ''بہت زیادہ'' یا ''بار بار'' کیا جاتا ہے اور تقلیل کے اعتبار سے اس کا ترجمہ ''کبھی کبھی'' کیا جاتا ہے۔ویسے کلام عرب میں یہ کافی استعمال ہوتا ہے لیکن قرآن مجید میں صرف سورۃ الحجر کی آیت 2 میں استعمال ہوا ہے۔﴿رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ۝﴾(15/الحجر:2)''کافر بار بار تمنا کریں گے کہ کاش ہم مسلمان ہوتے۔''(ترجمہ ماجدیؒ)''(عذاب میں گرفتار ہونے کے بعد) بہت آرزو کریں گے کفار کہ کاش وہ مسلمان ہوتے۔''(ترجمہ ضیاء القرآن)۔اس آیت میں رُبَمَا کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ فرماتے ہیں:''رُبَمَا۔یہ کلماتِ حسرت کی تکرار شاید اس لیے کہ جب جب کوئی نئی شدت واقع ہوگی، اور ساتھ ہی محسوس ہوگا کہ اس کی علت کفر ہی ہے، تو یہ حسرت ہر دفعہ تازہ ہو جائے گی۔''(تفسیر ماجدیؒ، ص ۵۶۹)

ع ل م

(ن۔ض) عَلَمًا نشان لگانا۔پہچان بنانا۔

عَلَمٌ ج: اَعْلَامٌ- نشان۔جھنڈا۔اونچا پہاڑ۔محل۔﴿ وَمِنْ اٰيٰتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ﴿۳۲﴾ ﴾(42/الشوریٰ:32) ''اوراس کی نشانیوں میں سے جہاز ہیں سمندر میں اونچے پہاڑوں کی مانند۔''

عَلَامَةٌ ج: عَلَامَاتٌ۔نشان۔علامت۔﴿ وَعَلٰمٰتٍ ؕ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۶﴾ ﴾(16/النحل:16)''اور علامتیں بھی (بنائیں)اور ستاروں سے بھی (لوگ) راہ پاتے رہتے ہیں۔''(ترجمہ ماجدیؒ)

عَالَمٌ ج:عَالَمُوْنَ -فَاعَلٌ اسم الآلہ کا ایک وزن ہے۔پہچاننے کا ذریعہ۔یہ عَلَمٌ سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے نشانی، علامت،ایسی علامت اور نشانی جس سے کسی کی پہچان ہو۔یہ کائنات اللہ تعالیٰ کی کاریگری کی علامت ہے جس سے ہم اُس کی پہچان کرتے ہیں۔اللہ تعالیٰ کے سوا ہر شے کو عَالَمٌ کہتے ہیں۔اس میں تمام مخلوق شامل ہے خواہ زمین پر ہو،آسمانوں میں اور جو کچھ ان کے درمیان ہے۔بعض اہل علم کے نزدیک عَالَمٌ نام ہے اُس چیز کا جس کے ذریعے سے علم حاصل ہو۔ پھر ان چیزوں کے لیے استعمال ہونے لگا جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا علم حاصل ہو۔جب اِس کی جمع عالمین بولی جائے تو یہ اور بھی عموم کا فائدہ دیتا ہے۔قرآن مجید میں صرف جمع ہی استعمال ہوئی ہے۔آیت زیر مطالعہ۔

(س) عِلْمًا حقیقت کو پہچان لینا۔جاننا۔﴿ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ ﴾(2/البقرۃ:60)''پہچان لیا ہر گروہ نے اپنا اپنا گھاٹ۔''﴿ اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۷﴾ ﴾(2/البقرۃ:77)''کیا وہ (یہ) نہیں جانتے کہ اللہ جانتا ہی جو وہ چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں۔''

عِلْمٌ اسم ذات بھی ہے۔علم۔قرآن مجید کی اصطلاح میں ''علم'' ایسی باتیں/حقائق کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ سے اپنے انبیاء ورسل کو دی ہوں۔جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۵﴾ ﴾(2/البقرۃ:145)''اور اگر (بفرض محال) آپؐ پیروی کریں ان کی خواہشوں کی اس کے بعد کہ آچکا آپؐ کے پاس علم تو یقیناً آپؐ اس وقت ظالموں میں (شمار) ہوں گے۔''(ترجمہ ضیاء القرآن)۔اسی طرح قرآن میں جہاں کہیں علم کی نفی آئی ہے، بالعموم وہاں مطلب یہ ہے کہ کوئی ایسی بات جس کی کوئی سند سابقہ انبیاء ورسل کی تعلیمات میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات یعنی قرآن وسنت میں موجود نہ ہو۔جیسے فرمایا:﴿ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ ﴾(17/بنی اسرائیل:36)''کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو۔جس کا تمہیں علم نہ ہو۔''﴿ وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ﴾(31/لقمان:15)''اور اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ تو کسی ایسے کو شریک کرے جسے تو نہیں جانتا تو ان کی بات ہرگز نہ مان۔''یہ اور ایسے متعدد مقامات پر علم نہ ہونے کا مطلب ہے قرآن وسنت میں سند نہ ہونا۔

واضح رہے کہ قرآن مجید میں بعض مقامات پر یہ لفظ اصطلاحی کے بجائے لغوی مفہوم میں بھی آیا ہے جیسے قارون کا قول نقل کرتے ہوئے فرمایا:﴿ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ؕ ﴾(28/القصص:78)''تو اس نے کہا'' یہ سب کچھ تو مجھے اس علم کی بنا پر دیا گیا ہے، جو مجھ کو حاصل ہے۔''یہاں علم کا مطلب ہے تجربہ،مہارت، ہنرمندی۔کوئی اگر آیت کے سیاق وسباق کو نظر میں رکھے تو وہ آسانی سے تمیز کرسکتا ہے کہ کہاں یہ لفظ لغوی مفہوم میں آیا ہے۔حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں''محاورہ قرآن میں علم سے مراد علم حقائق سے ہوتی ہے اور بے علمی سے مراد اس علم سے محرومی ہے۔ علم سے قرآنِ مجید میں کہیں بھی وہ چیزیں مراد نہیں لی ہیں جنہیں دنیا میں علوم وفنون کہا جاتا ہے۔''(تفسیر ماجدیؒ،صفحہ 929) ۔قرآن مجید کی ایک آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی عِلْمٌ بمعنی نشانی کہا گیا ہے﴿ وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ ﴾ (43/الزخرف:61)''اور وہ (یعنی ابنِ مریم) دراصل قیامت کی ایک نشانی ہیں۔''

اَعْلَمُ (1) مضارع کا واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ میں جانتا ہوں۔﴿ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾(2/البقرۃ:30)''اللہ تعالیٰ نے فرمایا بے شک میں جانتا ہوں وہ جو تم نہیں جانتے۔''﴿ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ ﴾(5/المائدۃ:116)''اور میں نہیں جانتا جو آپ کے جی میں ہے۔''

(2) افعل التفضیل میں واحد مذکر کا صیغہ ہے۔ کسی سے زیادہ یا سب سے زیادہ جاننے والا۔﴿ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ﴾(2/البقرۃ:140)''آپؐ فرمائیے کیا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ۔''﴿ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ ﴾(68/القلم:7)''بے شک آپؐ کا رب خوب جانتا ہے اُسے جو گمراہ ہوا اُس کے راستے سے۔''اس صورت میں عام طور پر 'ب' کا صلہ آتا ہے۔(واللہ اعلم)

اِعْلَمْ ج: اِعْلَمُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو جان۔﴿ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴾(2/البقرۃ:260)''خوب اچھی طرح سے جان لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ عزیز اور حکیم ہے۔''﴿ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ ﴾(2/البقرۃ:194)''اور تقویٰ اختیار کرو اللہ تعالیٰ کا اور خوب اچھی طرح سے جان لو کہ اللہ تعالیٰ متقین کے ساتھ ہے۔''

عَالِمٌ ج: عٰلِمُوْنَ۔ عالم۔ جاننے والا۔﴿ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَ الشَّهَادَةِ ﴾(6/الانعام:73)''وہ ہر چھپی چیز اور ظاہر چیز کا جاننے والا ہے۔''﴿ وَمَا یَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ﴾(29/العنکبوت:43)''اور ان کو وہی لوگ سمجھتے ہیں جو علم رکھنے والے ہیں۔''

عَلِیْمٌ ج: عُلَمَاءُ۔ فَعِیْلٌ کے وزن پر مبالغے کا صیغہ ہے۔ ہمیشہ اور ہر حال میں جاننے والا۔﴿ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴾(2/البقرۃ:29)''اور وہ ہر چیز کو ہمیشہ سے جاننے والا ہے۔''﴿ اِنَّمَا یَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ﴾(37/فاطر:28)''حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اُس سے ڈرتے ہیں۔'' اَلْعَلِیْمُ اسمائے حسنیٰ میں سے بھی ہے۔ نوٹ: عُلَمَاءُ، قرآنِ مجید میں دو ہی مرتبہ استعمال ہوا ہے، الشعراء کی آیت 197 میں اور فاطر 28 میں۔ اور دونوں جگہ اس کا رسم الخط میم کے بعد واؤ کے ساتھ ہے جس پر ہمزہ ہے اور واؤ کے بعد الف بھی لکھا جاتا ہے یعنی: عُلَمٰٓؤُا یہ اس کا مخصوص املاء ہے۔

عَلَّامٌ فَعَّالٌ مبالغہ کا وزن ہے۔ عَلَّامٌ اسی وزن پر ہے۔ اس کے آگے ۃ مبالغہ لگا دیں تو عَلَّامَۃٌ بنتا ہے۔ مطلب ہے بہت زیادہ جاننے والا۔﴿ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ﴾(5/المائدہ:109)''بیشک تو غیب کا بہت زیادہ جاننے والا ہے۔''

مَعْلُوْمٌ اسم المفعول ہے۔ جس کو جانا گیا۔ جانا ہوا۔ معلوم۔﴿ وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْیَةٍ اِلَّا وَ لَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ﴾(15/الحجر:4)''اور نہیں ہلاک کیا ہم نے کسی بستی کو مگر یہ کہ اس کی (ہلاکت کا وقت) لکھا ہوا تھا جو معلوم تھا۔''(ترجمہ ضیاء القرآن)

مَعْلُوْمَةٌ ج: مَعْلُوْمَاتٌ۔ مَعْلُوْمٌ کا مونث۔﴿ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ﴾(2/البقرۃ:197)''حج کے چند مہینے ہیں جو معلوم ہیں۔''

(تفعیل) تَعْلِیْمًا رفتہ رفتہ تدریجاً علم دینا۔ سکھانا۔﴿ اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ﴾(55/الرحمٰن:1-2)''رحمٰن نے قرآن کا علم دیا۔''

مُعَلِّمٌ اسم الفاعل ہے۔ علم سکھانے والا۔

مُعَلَّمٌ اسم المفعول ہے۔ جس کو علم سکھایا گیا۔﴿ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ ﴾(44/الدخان:14)''پھر انہوں نے منہ پھیر لیا اس سے اور کہا سکھایا ہوا ہے، دیوانہ۔''

(تفعّل) تَعَلُّمًا کوشش کر کے، محنت کر کے علم حاصل کرنا، سیکھنا۔﴿ وَیَتَعَلَّمُوْنَ مَا یَضُرُّهُمْ وَلَا یَنْفَعُهُمْ ﴾(2/البقرۃ:102)''اور وہ لوگ سیکھتے ہیں جو ان کو نقصان دیتا ہے اور نفع نہیں دیتا۔''

ترکیب رَبِّ الْعَالَمِیْنَ مرکب اضافی ہے اور اس کے مضاف رَبِّ کی جر بتا رہی ہے کہ یہ اَللّٰهِ کی صفت یا بدل ہے۔ بدل ماننے سے ترجمہ

میں آسانی ہوگی۔اسی طرح اَلرَّحْمٰنِ اور الرَّحِیْمِ کی جر بتا رہی ہے کہ یہ بھی اَللّٰہِ کی صفت یا بدل ہیں۔

ترجمہ	رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ	الرَّحْمٰنِ	الرَّحِیْمِ
	جو تمام جہانوں کا پرورش کرنے والا ہے	جو رحمٰن ہے	جو رحیم ہے

نوٹ۔1 یہاں عالمین جمع کے صیغے میں آنے کے متعلق حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ اس عالم کا بھی رب ہے جسے ہم جانتے ہیں اور ان تمام عالموں کا بھی ربّ ہے جنہیں ہم نہیں جانتے۔

آیت:3

﴿ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ ﴾

م	ل	ك

(ض) مِلْكًا مالک ہونا۔غالب ہونا۔اختیار رکھنا۔﴿ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا ﴾(7/الاعراف:188)''آپ ﷺ کہہ دیجئے کہ میں اختیار نہیں رکھتا اپنے نفس کے لئے کسی نفع کا اور نہ ہی کسی نقصان کا۔''

مَالِكٌ اسم الفاعل ہے۔مالک۔غالب ہونے والا۔اختیار رکھنے والا۔آیت زیر مطالعہ۔

مَمْلُوْكٌ اسم المفعول ہے۔غلام۔وہ جو کسی کی ملکیت میں ہو۔﴿ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا ﴾(16/النحل:75)''بیان کی اللہ نے ایک مثال ایک غلام بندے کی۔''

مُلْكٌ ملک۔جس پر اختیار و اقتدار حاصل ہو۔﴿ قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ﴾(3/آل عمران:26)''آپ ﷺ کہہ دیجئے کہ اے اللہ ملک کے مالک تو ملک دیتا ہے جس کو تو چاہتا ہے اور تو ملک چھین لیتا ہے جس سے تو چاہتا ہے۔''

مَلْكٌ اختیار۔﴿ قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا ﴾(20/طٰہٰ:87)''انہوں نے جواب دیا''ہم نے آپ سے وعدہ خلافی اپنے اختیار سے نہیں کی۔''

مَلِكٌ ج:مُلُوْكٌ۔بادشاہ۔''عربی زبان میں مَلِكٌ ایسے شخص کو بھی کہہ دیا جاتا ہے جو آسودہ حال ہو،مکان،جائیداد،نوکر چاکر رکھتا ہو''(معارف القرآن)﴿ وَ قَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖ ﴾(12/یوسف:54)''اور بادشاہ نے کہا کہ اسے لے آؤ میرے پاس۔''﴿ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا ﴾(27/النحل:34)''بیشک بادشاہ جب داخل ہوتے ہیں کسی بستی میں تو اس میں بگاڑ پیدا کرتے ہیں۔''

مَلِيْكٌ مَلِكٌ سے صفت کا صیغہ برائے مبالغہ ہے۔بہت بڑا بادشاہ۔﴿ فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ ۝ ﴾(54/القمر:55)''سچی عزت کی جگہ،بڑے ذی اقتدار بادشاہ کے قریب۔''

مَلَاكٌ ، مَلَكٌ ج: مَلَآئِكَةٌ ۔فرشتہ۔مَلَكٌ لفظ اَلْوُكَةٌ سے مشتق ہے۔جس کے معنی ہیں''پیغام رسانی'' کیونکہ فرشتے اللہ تعالیٰ کا پیغام اس کے مقبول بندوں تک پہنچانے کے لیے مامور ہیں اس لیے انہیں اس نام سے موسوم کیا گیا۔(ضیاء القرآن)۔ مَلَآئِكَةٌ میں 'ۃ' تانیث الجمع کی ہے۔﴿ قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَ لَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَ لَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ﴾(6/الانعام:50)''آپ ﷺ کہہ دیجئے کہ میں نہیں کہتا تم سے کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور میں نہیں جانتا غیب کو اور میں نہیں کہتا تم سے کہ میں فرشتہ ہوں۔''﴿ وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ﴾(2/البقرۃ:30)''اور یاد کرو جب فرمایا تمہارے رب نے فرشتوں سے کہ بے شک میں بنانے والا ہوں زمین میں ایک نائب۔''

مَلَکُوْتٌ مُلْکٌ سے انتہائی مبالغے کا صیغہ ہے۔ بادشاہت (یہ لفظ صرف اللہ تعالیٰ کی بادشاہت کے لئے مخصوص ہے اور اس لفظ میں مُلْکٌ (بادشاہی) اور مِلْکٌ (ملکیت) دونوں مفہوم شامل ہیں) ﴿ اَوَ لَمْ یَنْظُرُوْا فِیْ مَلَکُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ﴾ (7/الاعراف:185) ''تو کیا یہ لوگ نظر نہیں کرتے زمین اور آسمانوں کی بادشاہت میں۔''

یَوْمٌ ج: اَیَّامٌ۔ بمعنی دن۔ غروب آفتاب سے لے کر اگلے دن کے غروب آفتاب تک کا وقت۔ لیل اور نہار کے وقت کا مجموعہ۔ ۲۴ گھنٹے۔ یَوْم کی یہ مدت انسان کے لیے ہے اور اس کا تصور بھی سورج اور زمین کی پیدائش کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے ورنہ اللہ کے ہاں یَوْم کی مدت ایک طویل دور ہے خواہ یہ دور ہمارے حساب سے ہزاروں سال تک پھیلا ہوا ہو۔ اسی لیے زمین و آسمان کی پیدائش کے سلسلہ میں جب یَوْم کا ذکر آئے گا تو اس سے مراد ایک طویل دور ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَ اِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴾ (22/الحج:47) ''اور بے شک تمہارے رب کے نزدیک ایک یوم تمہارے حساب کی رُو سے ایک ہزار سال کے برابر ہے۔'' اسی طرح یوم الدین یعنی جزا و سزا کا دن بھی ایک طویل دور ہوگا جس کی مدت احادیث میں پچاس ہزار سال بیان کی گئی ہے۔ اَلْیَوْم: بمعنی آج کا دن۔ اور اَلْیَوْم کے وقت کی مقدار نَھَار کے مطابق ہوگی یَوْم کے مطابق نہیں۔ یعنی اس سے مراد طلوع آفتاب سے لے کر غروب آفتاب کا وقت ہوگا۔ ظلّ الیوم بمعنی آج سارا دن سایہ رہا (منجد)۔ اَلْیَوْم کا لفظ قرآن کریم میں بیشتر مقامات پر قیامت کے دن کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ یَوْمَئِذٍ: یَوْم کے بعد اِذْ کے اضافہ سے یہ لفظ بنا ہے جو کسی معین زمانہ کی طرف اشارہ کے لیے آتا ہے۔ بمعنی اُس دن یا وہ دن۔ قرآن مجید میں یہ لفظ م کی زیر کے ساتھ یَوْمِئِذٍ بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً: سورہ ھود، آیت 66۔

نوٹ: عربی زبان میں نعمتوں کو بھی اَیَّامٌ کہا جاتا ہے اور اس سے مراد تاریخ کے وہ دن بھی ہوتے ہیں جن میں قوموں پر اللہ کی رحمت یا عذاب کے بڑے بڑے واقعات پیش آئے ہوں۔ ایام العرب سے مراد اہل عرب کی جنگیں ہیں۔ قرآنِ مجید میں فرمایا: ﴿ وَ ذَكِّرْهُمْ بِاَیّٰىهُ اللّٰهِ ﴾ (14/ابراہیم:5) ''اور یاد دلاؤ انہیں اللہ تعالیٰ کے دن۔'' اس آیت کے تحت پیر کرم شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: ''عربی میں نعمتوں کو بھی ایام کہا جاتا ہے اور گزشتہ واقعات کو بھی۔ یہاں دونوں معنی مراد لیے جا سکتے ہیں۔'' اور مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں: ''بِاَیّٰىهُ اللّٰهِ یعنی جو بڑی بڑی نعمتیں قدرت کی طرف سے مختلف قوموں کو عطا ہوتی رہیں مثلاً حکومت و اقتدار یا جو بڑی بڑی مصیبتیں مختلف قوموں کو قدرت کی طرف سے پیش آتی رہیں۔ مثلاً وبا و قحط، محکومی و غلامی۔ غرض یہ کہ ایام اللہ کے تحت میں ہر قسم کے اہم تاریخی واقعات آجاتے ہیں۔ ایام کی اضافت اللہ کی جانب ان واقعات کی اہمیت پر دلالت کرنے کے لیے ہے۔''

د	ی	ن

(ض) دِیْنًا مالک ہونا، حکم دینا، ذلیل کرنا / خدمت کرنا، فرماں برداری کرنا، ماتحت ہونا، قبول کرنا۔ (متضاد مفہوم ہے) ﴿ وَ لَا یَدِیْنُوْنَ دِیْنَ الْحَقِّ ﴾ (9/التوبۃ:29) ''اور نہ قبول کرتے ہیں سچے دین کو۔''

دِیْنٌ ج: اَدْیَانٌ۔ اسم ذات بھی ہی اور قرآن مجید میں کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے مثلاً: (1) بدلہ۔ جزا۔ بدلے سے مراد اس کے دونوں پہلو ہیں۔ نیک اعمال کا اچھا بدلہ اور برے اعمال کا برا بدلہ۔ آیت زیر مطالعہ اور ﴿ وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا یَوْمُ الدِّیْنِ ۝ ثُمَّ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا یَوْمُ الدِّیْنِ ۝ ﴾ (82/الانفطار:17-18) ''اور تم کیا جانتے ہو کہ وہ جزا کا دن کیا ہے؟ ہاں! (بولو) تمہیں کیا خبر کہ وہ جزا کا دن کیا ہے؟'' ﴿ یَوْمَئِذٍ یُّوَفِّیْهِمُ اللّٰهُ دِیْنَهُمُ الْحَقَّ ﴾ (24/النور:25) ''اس دن اللہ تعالیٰ انہیں پورا پورا بدلہ حق و انصاف کے ساتھ دے گا۔'' (ترجمہ احسن البیان) (2) ضابطۂ حیات یا دوسرے الفاظ میں

مذہب وشریعت۔﴿ وَمَنْ اَحْسَنُ دِیْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ ﴾(4/النساء:125)''اوراس سے بہتر کس کا دین ہوگا جس نے پیشانی رکھی اللہ کے حکم پر اور نیک کاموں میں لگا ہوا ہے۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)﴿ اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰهِ یَبْغُوْنَ ﴾(3/آل عمران:83)''سو کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے علاوہ (کسی طریقہ کو) تلاش کررہے ہیں۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)﴿ وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ ﴾(3/آل عمران:85)''اور جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کو تلاش کرے گا سو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)(3) اطاعت اور فرمانبرداری۔﴿ اِنَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ ﴾(39/الزمر:2)''ہم نے تمہاری طرف کتاب اُتاری ہے حق کے ساتھ تو اللہ ہی کی بندگی کرو اُسی کے لیے اطاعت کو خالص کرتے ہوئے۔'' (ترجمہ ازتدبر قرآن)۔﴿ وَّلَهُ الدِّیْنُ وَاصِبًا ﴾(16/النحل:52)''اور اسی کی تابعداری اور اطاعت لازمی ہے۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ اس آیت کے تحت صاحبؒ ضیاء القرآن فرماتے ہیں:''دین سے مراد اطاعت واخلاص ہے۔ واصبًا کا معنی ہمیشہ ہے جب کوئی شخص کسی کام کو ہمیشہ پابندی سے کرے تو کہتے ہیں وصب الرجل علی الامر اذا واظب علیه۔ (قرطبیؒ) معنی یہ ہے کہ اسی کی اطاعت وفرمانبرداری ہر شخص پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لازم ہے۔'' (ضیاء القرآن، ۲،ص ۵۷۵)۔(4) قانونِ ملکی۔﴿ مَا كَانَ لِیَاْخُذَ اَخَاهُ فِیْ دِیْنِ الْمَلِكِ ﴾(12/یوسف:76)''یوسفؑ اپنے بھائی کو بادشاہِ مصر کے قانون کے لحاظ سے نہیں لے سکتے تھے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ اور تقریباً تمام بزرگوں نے اس آیت میں 'دین' کا ترجمہ 'قانون' سے کیا ہے۔(5) وہ اصول و احکام جو حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت محمد ﷺ تک سب انبیاء میں مشترک ہیں۔﴿ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِهٖ نُوْحًا ﴾(42/الشوریٰ:13)''اُس نے تمہارے لیے، دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے، جس کا حکم اس نے نوحؑ کو دیا تھا۔'' (نوٹ: دین کی بقیہ تفصیل آگے نوٹ میں دیکھیں)۔

اَلدِّیْنُ اسلام کا ضابطہ حیات۔﴿ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ﴾(3/آل عمران:19)''یقیناً دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)

مَدِیْنٌ ج: مَدِیْنُوْنَ۔ دِیْنٌ مصدر سے اسم المفعول ہے۔ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔(1) وہ جس کو بدلہ دیا جائے۔(2) محکوم۔ تابع دار۔ وہ جو کسی کے حکم کا پابند ہو۔ زیرِ فرمان۔ قرآنِ مجید میں یہ لفظ اِن دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔﴿ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِیْنُوْنَ ﴾(37/الصافات:53)''کیا جب ہم مر گئے اور ہو گئے مٹی اور ہڈیاں، کیا ہم کو جزا ملے گی۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔﴿ فَلَوْ لَاۤ اِنْ كُنْتُمْ غَیْرَ مَدِیْنِیْنَ ﴾(56/الواقعہ:86)''پس اگر تم کسی کے پابند حکم نہیں ہو۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ اسی آیت کا ترجمہ پہلے مفہوم کے لحاظ سے بھی کیا گیا ہے''تو اگر تمہارا حساب کتاب ہونے والا نہیں۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ مَدِیْنٌ غلام اور لونڈی کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ اپنے مالک کے حکم کے تابع ہوتے ہیں۔

(ض) دَیْنًا قرض دینا۔

دَیْنٌ قرض۔ (دَیْنٌ مصدر ہے مطلب ہے قرض دینا لیکن عربی میں اکثر مصدر بطور اسم الذات بھی استعمال ہوتے ہیں)﴿ مِنْۢ بَعْدِ وَصِیَّةٍ یُّوْصِیْ بِهَاۤ اَوْ دَیْنٍ ﴾(4/النساء:11)''وصیت کے بعد جو اس نے وصیت کی یا قرضہ کے بعد۔'' مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں''دَیْنٌ کا لفظ بہت وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ عربی میں یہ (عین) کے مقابلے میں ہے۔ اور اس کا اطلاق ہر اس معاملت پر ہوتا ہے جس کے معاوضے کا ایک جزء فی الفور نہ ہو۔'' (تفسیر ماجدیؒ،ص ۱۴۹)

(تفاعل) تَدَایَنًا باہم ادھار پر لین دین کرنا۔﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاكْتُبُوْهُ ﴾(2/البقرۃ:282)''جب تم لوگ قرض کا لین دین کرو ایک مقررہ مدت کے لئے تو اسے لکھ لو۔''

نوٹ: دِیْنٌ: حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں:''عربی زبان میں لفظ دین کے چند معانی ہیں جن میں ایک معنی ہے طریقہ اور روش،

قرآن کی اصطلاح میں لفظ دین ان اصول و احکام کے لیے بولا جاتا ہے جو حضرت آدمؑ سے خاتم الانبیاء ﷺ تک سب انبیاءؑ میں مشترک ہیں' اور لفظ ''شریعت'' یا ''منہاج'' یا بعد کی اصطلاحات میں لفظ ''مذہب'' فروعی احکام کے لیے بولے جاتے ہیں، جو مختلف زمانوں اور مختلف امتوں میں مختلف ہوتے چلے آئے ہیں، قرآن کریم کا ارشاد ہے: ﴿ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا ﴾ (42/الشوریٰ:13) ''یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے وہی دین جاری فرمایا جس کی وصیت تم سے پہلے نوح علیہ السلام کو اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کو کی گئی تھی۔'' اس سے معلوم ہوا کہ دین سب انبیاء علیہم السلام کا ایک ہی تھا، یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کے جامع کمالات اور تمام نقائص سے پاک ہونے اور اس کے سوا کسی کا لائقِ عبادت نہ ہونے پر دل سے ایمان اور زبان سے اقرار (توحید) روزِ قیامت اور اس میں حساب کتاب اور جزا و سزا اور جنت و دوزخ پر دل سے ایمان لانا اور زبان سے اقرار کرنا (آخرت)، اس کے بھیجے ہوئے ہر نبی و رسول اور ان کے لائے ہوئے احکام پر اسی طرح ایمان لانا (رسالت)۔ (معارف القرآن، جلد ۲، صفحہ: ۳۶)۔ مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں: دین کا لفظ عربی زبان میں متعدد مفہومات کا حامل ہے:

ایک مفہوم ہے غلبہ و اقتدار، مالکانہ اور حاکمانہ تصرف، سیاست و فرمانروائی اور دوسروں پر فیصلہ نافذ کرنا۔ چنانچہ لسان العرب میں ہے دَانَ النَّاسَ، اَیْ قَهَرَهُمْ عَلَى الطَّاعَةِ۔ دِنْتُهُمْ، اَیْ قَهَرْتُهُمْ۔ دِنْتُهُ، سُسْتُهُ وَمَلَكْتُهُ۔ وَفِي الْحَدِيْثِ: اَلْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ، اَیْ اَذَلَّهَا وَا اسْتَعْبَدَهَا۔ اَلدَّيَّانُ، اَلْقَاضِيْ، اَلْحَكَمُ، اَلْقَهَّارُ۔ وَلَا اَنْتَ دَيَّانِيْ، اَیْ لَسْتَ بِقَاهِرٍ لِّيْ فَتَسُوْسَ اَمْرِيْ۔ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ، اَیْ فِيْ قَضَاءِ الْمَلِكِ۔.....

دوسرا مفہوم ہے اطاعت، فرمانبرداری اور غلامی۔ لسان العرب میں ہے اَلدِّيْنُ، اَلطَّاعَةُ۔ دِنْتُهُ وَ دِنْتُ لَهُ اَیْ اَطَعْتُهُ۔ وَالدِّيْنُ لِلّٰهِ، اِنَّمَا هُوَ طَاعَتُهُ وَالتَّعَبُّدُ لَهُ، فِي الْحَدِيْثِ اُرِيْدُ مِنْ قُرَيْشٍ كَلِمَةً تَدِيْنُ لَهُمْ بِهَا الْعَرَبُ، اَیْ تُطِيْعُهُمْ وَ تَخْضَعُ لَهُمْ۔ ثُمَّ دَانَتْ بَعْدَ الرَّبَابِ، اَیْ ذَلَّتْ لَهُ وَ اَطَاعَتْهُ۔ يَمْرُقُوْنَ مِنَ الدِّيْنِ، اَیْ اَنَّهُمْ يَخْرُجُوْنَ مِنْ طَاعَةِ الْاِمَامِ الْمُفْتَرَضِ الطَّاعَةِ۔ اَلْمَدِيْنُ، اَلْعَبْدُ۔ فَلَوْ لَا اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ اَیْ غَيْرَ مَمْلُوْكِيْنَ۔

تیسرا مفہوم ہے وہ عادت اور طریقہ جس کی انسان پیروی کرے۔ لسان العرب میں ہے: اَلدِّيْنُ اَلْعَادَةُ وَ الشَّأْنُ۔ يُقَالُ مَا زَالَ ذٰلِكَ دِيْنِيْ وَدِيْدَنِيْ اَیْ عَادَتِيْ۔

ان تینوں مفہومات کو ملحوظ رکھتے ہوئے دین کے معنی اُس طرزِ عمل اور اس رویے کے ہیں جو کسی کی بالاتری تسلیم اور کسی کی اطاعت قبول کر کے انسان اختیار کرے۔ اور دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس کی بندگی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ''آدمی اللہ کی بندگی کے ساتھ کسی دوسرے کی بندگی شامل نہ کرے، بلکہ اسی کی پرستش، اسی کی ہدایت کا اتباع اور اسی کے احکام و اوامر کی اطاعت کرے۔'' (تفہیم القرآن، ج ۴، صفحہ ۳۵۶)

<u>دین، شریعت اور ملت:</u> دین کی وضاحت اوپر آ چکی ہے۔ شریعت سے مراد وہ احکام ہیں جو زمانے کی ضرورتوں کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔ مثلاً حضرت آدمؑ کی اولاد میں بہن بھائی کا نکاح جائز تھا جو بعد کی شریعتوں میں حرام کر دیا گیا۔ حضرت یعقوبؑ کی زوجیت میں دو حقیقی بہنیں تھیں جو بعد کی شریعتوں میں حرام قرار دی گئیں۔ غرض ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ دین اور شریعت کے اِس فرق کو خود رسول اللہ ﷺ نے اِن الفاظ میں سمجھایا: ((اَلْاَنْبِيَاءُ اِخْوَةُ الْعَلَّاتِ اُمَّهَاتُهُمْ شَتّٰى وَدِيْنُهُمْ وَاحِدٌ)) (متفق علیہ) ''تمام انبیاء علاتی بھائی (وہ بھائی جن کا باپ ایک اور مائیں الگ الگ ہوں) ہیں۔ کہ ان کی مائیں (شریعتیں) الگ الگ ہیں اور ان کا دین (باپ) ایک ہی ہے۔'' اور ملّت سے مراد وہ نظام ہے جو ایک نبی احکام الٰہیہ کی فرمانبرداری میں اپنے ماننے والوں کی جماعت میں قائم کرتا ہے۔ دین اور شریعت میں سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتا ہے اور الہامی کتاب میں مذکور ہوتا ہے۔ سب سے پہلے نبی خود ان احکام پر عمل کرنے کا پابند ہوتا ہے ساتھ ہی وہ اِن احکام الٰہیہ کی تبلیغ کر کے اپنے ماننے والوں کی ایک جماعت بناتا ہے اور اُن سب کو بھی اِن احکامات کا پابند بناتا ہے اور ایک اسلامی نظام قائم کرتا ہے اِس نظام کا نام ملّت ہے۔ گویا ملّت احکام کا نام نہیں بلکہ اُس نظام کا نام ہے جس میں نبی امیر، اُس نبی کے ماننے والے مامور اور اُن کا دستور احکام الٰہیہ (دین، شریعت) ہوتا ہے۔ ملّت کی نسبت کسی مخصوص نبی کی طرف کی جا سکتی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ (آل عمران 95) ''پس تم ملت ابراہیمؑ کی پیروی کرو جو سب سے بے تعلق ہو کر ایک اللہ ہی کے ہو گئے تھے۔'' (مترادفات القرآن۔ تلخیصاً)

ترکیب مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ مرکب اضافی ہے۔ اس کے مضاف مٰلِكِ کی جر بتا رہی ہے کہ یہ پورا مرکب اللہ کی صفت یا بدل ہے۔

ترجمہ	مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝۳
	جو بدلے کے دن کا مالک ہے

آیت:4
﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝۴ ﴾

اِيَّا یہ کلمہ ضمائر منصوبہ متصلہ یعنی ضمیر مفعولی کو منفصل لکھنے اور اُس کے تلفظ کے لیے وضع کیا گیا ہے اور بالعموم حصر کا مفہوم پیدا کرتا ہے مثلاً ضَرَبْتُهٗ۔اس میں ضمیر مفعولی فعل کے ساتھ ملا کر یعنی متصل لکھی ہے اور اس کے معنی ہیں۔''میں نے اس کو مارا'' اس میں کسی اور کو مارنے کی نفی نہیں ہے۔اب اگر ہم کہیں ضَرَبْتُ اِيَّاهُ تو اس کے معنی ہیں''میں نے اس کو ہی مارا'' اس میں کسی اور کو مارنے کی نفی شامل ہے۔اس کو حصر کا مفہوم کہتے ہیں۔اب اگر ہم کہیں اِيَّاهُ ضَرَبْتُ تو معنی وہی رہیں گے البتہ حصر میں مزید زور اور تاکید پیدا ہو جائے گی۔جیسے He Must Come میں جب مزید زور پیدا کرنا ہو تو ہم کہتے ہیں Come He Must۔

اب یہ نوٹ کرلیں کہ بات سمجھانے کی غرض سے ہم نے ضَرَبْتُ اِيَّاهُ استعمال کیا ہے ورنہ عربی میں اس کا رواج نہیں ہے۔قاعدہ یہ ہے کہ ضمیر مفعولی جب اِيَّا کے ذریعہ منفصل کی جائے گی تو وہ فعل سے پہلے آئے گی۔یعنی اِيَّاهُ ضَرَبْتُ کہا جائے گا۔مثلاً ﴿ وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۝۱۱۴ ﴾ (16/النحل:114) ''اور تم لوگ شکر کرو اللہ کی نعمت کا اگر تم لوگ صرف اور صرف اس کی ہی عبادت کرتے ہو۔'' اس قاعدہ کے دو استثناء ہیں۔

پہلا استثناء یہ ہے کہ کسی فعل کے بعد اگر اِلّا آئے تو اِيَّا اور ضمیر مفعولی فعل کے بعد آسکتی ہے جیسے ﴿ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ﴾ (17/بنی اسرائیل:23) ''اور فیصلہ کر دیا تیرے رب نے کہ تم لوگ عبادت مت کرو مگر صرف اس کی ہی۔'' نوٹ کرلیں کہ ایسی صورت میں حصر کا مفہوم اِيَّا کی وجہ سے نہیں بلکہ جملہ کی ساخت کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔(یعنی نفی+استثناء)

دوسرا استثناء یہ ہے کہ کسی فعل کے بعد اگر دو ضمیر مفعولی لانا ہوں تو ان کے درمیان اِيَّا لگاتے ہیں۔یعنی ضَرَبْتُ هُمْ و كُمْ کہنا درست نہیں ہے۔بلکہ ضَرَبْتُهُمْ وَاِيَّا كُمْ کہا جائیگا۔جیسے ﴿ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ﴾ (17/بنی اسرائیل:31) ''ہم رزق دیتے ہیں ان کو اور تم کو بھی۔'' ایسی صورت میں اِيَّا میں حصر کا مفہوم باقی نہیں رہتا۔

ع	ب	د

(ن) **عُبُوْدِيَّةً عِبَادَةً** کسی کے سامنے ذلت اور انکساری ظاہر کرنا۔

اس لفظ کی اتنی اہمیت ہے کہ اس ایک لفظ کے ذریعے سے تمام انسانوں اور جنوں کی تخلیق کا مقصد قرآنِ مجید میں بیان کیا گیا ہے فرمایا: ﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝۵۶ ﴾ (51/الذاریات:56) ''میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری بندگی (یعنی نہ صرف پرستش و بندگی بلکہ غلامی و اطاعت بھی) کریں۔''

کسی کو معبود مان کر اس کے احسانات کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی انتہائی تعظیم اور محبت کی وجہ سے اس کے سامنے اپنے اختیار سے اپنی انتہائی عاجزی اور فرمانبرداری کا اظہار کرنا، اس کی مکمل اطاعت کرنا، غلامی کرنا، بندگی کرنا عبادت کہلاتا ہے۔عبادت میں بنیادی مفہوم اطاعت کا ہے کیونکہ یہ بات غلط معلوم ہوتی ہے کہ انسان جس کے سامنے انتہائی عاجزی کا اظہار کرے، زندگی کے معاملات میں اس کی اطاعت نہ کرے۔اور اطاعت کبھی جزوی ہوتی ہے اور کبھی مجبوری سے۔ جزوی اور مجبوری سے کی ہوئی اطاعت، عبادت نہیں کہلاتی۔کسی کے احسانات کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی محبت میں ڈوب کر جب اطاعت کی جائے اور زندگی کے ہر معاملہ اور ہر لمحہ میں کی جائے تو ایسی اطاعت، عبادت کہلاتی ہے۔اسی طرح اگر کوئی شخص عبادت کے بہت سے کام اپنے اختیار سے نہیں کر رہا بلکہ کسی مجبوری یا کسی عمل کے زیر اثر کر رہا ہے تب بھی وہ

عبادت نہیں کہلائے گی کیونکہ اس کا اپنا اختیار اس میں شامل نہیں اور اسی طرح اگر کوئی شخص عبادت کے بہت سے کام کسی کی تعظیم کی وجہ سے نہیں بلکہ مذاق کے طور پر کر رہا ہے تب بھی وہ عبادت نہیں کہلائیں گے۔ اس لیے بعض علماء کا قول ہے: اَلْعِبَادَةُ تَذَلُّلٌ لِّلْغَيْرِ عَنْ اِخْتِيَارٍ لِغَايَةِ تَعْظِيْمِهٖ فَخَرَجَ التَّسْخِيْرُ وَالسَّخْرُ وَالْقِيَامُ وَالْاِنْحِنَاءُ لِنَوْعِ تَعْظِيْمٍ ''عبادت اپنے اختیار سے دوسرے کی انتہائی تعظیم کی غرض سے اس کے لیے عاجزی کا نام ہے۔ لہٰذا تسخیر کی بنا پر یا مذاق کی غرض سے ایسا کرنا نیز تعظیم رسمی کے لیے کسی کے واسطے کھڑا ہو جانا یا جھک جانا عبادت کی طرف سے خارج ہے۔'' اسی لیے محض کسی کے سامنے عاجزی اور انکساری کا اظہار کرنا عبادت نہیں مثلاً اگر کوئی بیٹا والد کے سامنے عاجزی اور انکساری کا اظہار کرے تو یہ تعظیم اور ادب ہے، عبادت نہیں، یہی تعظیم اور انکساری کوئی شخص اللہ کو معبود مان کر اور اُس کے احسانات کو تسلیم کر کے کرے تب یہ عبادت ہے۔ ہمارے بزرگوں نے عبادت کی وضاحت یوں کی ہے۔ حضرت امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: لَفْظُ الْعُبُوْدِيَّةِ يَتَضَمَّنُ كَمَالَ الذُّلِّ وَكَمَالَ الْحُبِّ۔ ''لفظ عبودیت میں دو چیزیں لازمی طور پر شامل ہیں، کمالِ ذُلّ یعنی اپنے آپ کو اللہ کے سامنے بچھا دینا اور کمالِ محبت یعنی اللہ کے سامنے یہ جھکنا محبت اور دل کی پوری آمادگی کے ساتھ ہو۔'' امام ابن قیمؒ فرماتے ہیں: اَلْعِبَادَةُ تَجْمَعُ اَصْلَيْنِ غَايَةَ الْحُبِّ مَعَ غَايَةِ الذُّلِّ وَالْخُضُوْعِ یعنی عبادت میں دو چیزیں لازماً شامل ہوں گی، اور وہ یہ کہ ایک طرف انتہائی درجے کی محبت اور دوسری طرف اس کے ساتھ انتہائی درجے کا جھکنا اور عاجزی۔ علامہ ابن الاثیرؒ فرماتے ہیں: اَلْعِبَادَةُ فِي اللُّغَةِ اَلطَّاعَةُ مَعَ الْخُضُوْعِ۔ لغت میں عبادت نام ہے اُس اطاعت کا جو عاجزی کے ساتھ ہو۔ علامہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں: وَ فِي الشَّرْعِ عِبَارَةٌ عَمَّا يَجْمَعُ كَمَالَ الْمَحَبَّةِ وَالْخُضُوْعِ وَالْخَوْفِ۔ اور (عبادت) شرع میں عبارت ہے اس چیز سے جو انتہائی محبت، عاجزی اور خوف پر مشتمل ہو۔ شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں: ''مشغول کردن تمام اعضاء و جوارح ظاہر و باطن را در راہِ اُو و بمرضیاتِ اُو'' تمام اعضاء و جوارح ظاہر اور باطن کو مشغول کر دینا اس (اللہ) کی راہ میں اس کی مرضی کے مطابق۔ مولانا امین احسن اصلاحیؒ تدبر قرآن میں فرماتے ہیں: عبادت کے اصلی معنی عربی لغت میں انتہائی خضوع اور انتہائی عاجزی و فروتنی کے اظہار کے ہیں۔ لیکن قرآن میں یہ لفظ اس خضوع و خشوع کی تعبیر کے لیے خاص ہو گیا ہے جو بندہ اپنے خالق و مالک کے لیے ظاہر کرتا ہے۔ پھر اطاعت کا مفہوم بھی اس لفظ کے لوازم میں داخل ہو گیا ہے کیونکہ یہ بات بالبداہت غلط معلوم ہوتی ہے کہ انسان جس ذات کو اپنے انتہائی خضوع و خشوع کا واحد مستحق سمجھے زندگی کے معاملات میں اس کی اطاعت کو لازم نہ جانے۔ چنانچہ عبادت کی اس حقیقت کو قرآن مجید نے بعض جگہ کھول بھی دیا ہے مثلاً: ﴿ اِنَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝ ﴾ (39/الزمر:2) ''ہم نے تمہاری طرف کتاب اتاری ہے حق کے ساتھ تو اللہ ہی کی بندگی کرو اسی کے لیے اطاعت کو خاص کرتے ہوئے۔'' عبادت کے ساتھ اطاعت کا یہ تعلق اس قدر گہرا ہے کہ بعض جگہ یہ لفظ صاف صاف اطاعت کے مفہوم ہی کے لیے استعمال ہو گیا ہے مثلاً: ﴿ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ ﴾ (36/یٰسٓ:60) ''کہ شیطان کی عبادت نہ کرو کیونکہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔'' (تدبر قرآن، جلد ۱، صفحہ: ۵۷)۔ مولانا مودودیؒ تفہیم القرآن میں فرماتے ہیں: عبادت کا مادہ عبد ہے۔ اور یہ لفظ ''آزاد'' کے مقابلے میں ''غلام'' اور ''مملوک'' کے لیے عربی زبان میں مستعمل ہوتا ہے۔ اسی معنی کے لحاظ سے ''عبادت'' میں دو مفہوم پیدا ہوئے ہیں۔ ایک پوجا اور پرستش، جیسا کہ عربی زبان کی مشہور و مستند لغت ''لسان العرب'' میں ہے: عَبَدَ اللّٰهَ، تَأَلَّهَ لَهٗ۔ وَالتَّعَبُّدُ، اَلتَّنَسُّكُ۔ دوسرے عاجزانہ اطاعت اور برضا و رغبت فرمانبرداری جیسا کہ لسان العرب میں ہے، اَلْعِبَادَةُ، اَلطَّاعَةُ، وَمَعْنَى الْعِبَادَةِ فِي اللُّغَةِ اَلطَّاعَةُ مَعَ الْخُضُوْعِ۔ وَكُلُّ مَنْ دَانَ لِمَلِكٍ فَهُوَ عَابِدٌ لَّهٗ (وَقَوْمُهُمَا لَنَا عَابِدُوْنَ)۔

وَالْعَابِدُ، اَلْخَاضِعُ لِرَبِّهٖ اَلْمُسْتَسْلِمُ الْمُنْقَادُ لِاَمْرِهٖ۔ عَبَدَ الطَّاغُوْتَ، اَطَاعَهٗ يَعْنِي الشَّيْطَانَ فِيْمَا سَوَّلَ لَهٗ وَاَغْرَاهُ۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ، اَیْ نُطِيْعُ الطَّاعَةَ الَّتِيْ يَخْضَعُ مَعَهَا۔ اُعْبُدُوْا رَبَّكُمْ، اَطِيْعُوْا رَبَّكُمْ۔ پس لغت کی اِن مستند تشریحات کے مطابق مطالبہ صرف اللہ تعالیٰ کی پوجا اور پرستش ہی کا نہیں ہے بلکہ اس کے احکام کی بے چون و چرا اطاعت، اور اس کے قانونِ شرعی کی برضا و رغبت پیروی، اور اُس کے امر و نہی کی دل و جان سے فرمانبرداری کا بھی ہے۔ (تفہیم القرآن، ج ۴، صفحہ: ۳۵۵)

(ک) عُبُوْدَةً باپ دادا سے غلام ہونا، جدی پشتی غلام ہونا۔

عَابِدٌ ج: عَابِدُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ عبادت کرنے والا۔ بندہ۔ غلام۔ ﴿وَ لَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۙ﴾ (109/الکافرون:4) ''اور نہ ہی میں عبادت کرنے والا ہوں اُن کی جس کی تم پوجا کرتے ہو۔'' ﴿فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ۚ﴾ (23/المومنون:47) ''تو انہوں نے کہا کیا ہم ایمان لے آئیں اِن دو آدمیوں پر جو ہماری مانند ہیں، حالانکہ اُن کی قوم ہماری غلام ہے۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ عربی زبان میں عابد کے معنی مطیع، فرمانبردار اور خادم کے بھی آتے ہیں۔ چنانچہ حضرت شیخ الہندؒ وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ کا ترجمہ کرتے ہیں ''اور ان کی قوم ہماری تابعدار (خدمت گار) ہیں۔'' اور مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ترجمہ کرتے ہیں ''درآنحالیکہ ان کی قوم (بھی) ہمارے زیرِ حکم ہے۔''

عَابِدَةٌ ج: عَابِدَاتٌ۔ عَابِدٌ کی مونث۔ عبادت کرنے والی۔ بندی۔ ﴿قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ﴾ (66/التحریم:5) ''فرمانبردار، توبہ کرنے والیاں، عبادت کرنے والیاں۔''

عَبْدٌ ج: عِبَادٌ اور عَبِيْدٌ۔ غلام۔ بندہ۔ جس کی کوئی چیز اپنی نہ ہو۔ جس کی زندگی، خواہش غرضیکہ ہر چیز اس کے آقا کی ملکیت ہو۔ عَبْدٌ کا لفظ چار معنی میں استعمال ہوتا ہے (۱) اَلْعَبْدُ بمعنی غلام یعنی وہ انسان جسے خریدنا اور فروخت کرنا شرعاً جائز ہو چنانچہ آیات کریمہ ﴿وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ﴾ (2/البقرۃ:78) ''اور غلام کے بدلے غلام۔'' ﴿عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ﴾ (16/النحل:75) ''ایک غلام مملوک ہے جو کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتا۔'' میں عَبْدٌ کا لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ (۲) اَلْعَبْدُ بِالْاِيْجَادِ یعنی وہ بندہ جسے اللہ نے پیدا کیا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ ﴿اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ؕ﴾ (19/مریم:93) ''آسمان اور زمین میں جو بھی ہیں سب کے سب اللہ کے غلام بن کر ہی آنے والے ہیں۔'' (ترجمہ احسن البیان) میں اسی معنی کی طرف اشارہ ہے۔ (۳) عَبْدٌ وہ ہے جو عبادت اور خدمت کی بدولت عبودیت کا درجہ حاصل کر لیتا ہے اس لحاظ سے جن پر عَبْدٌ کا لفظ بولا گیا ہے وہ دو قسم پر ہیں ایک وہ جو اللہ تعالیٰ کے مخلص بندے بن جاتے ہیں چنانچہ ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا: ﴿نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ﴾ (25/الفرقان:1) ''جس نے اپنے بندے ﷺ پر قرآن نازل فرمایا۔'' اور اس طرح کی کئی اور آیات ہیں۔ (۴) دوسرے وہ جو دنیا کی لالچ اور حرص کے غلام بن کر ہر وقت اس کی پرستش میں لگے رہتے ہیں۔ چنانچہ ایسے لوگوں کے متعلق ہی آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ((تَعِسَ عَبْدُ الدِّرْهَمِ۔ تَعِسَ عَبْدُ الدِّيْنَارِ)) درہم و دینار کا بندہ ہلاک ہو۔

عَبْدٌ کے ان معانی کے پیشِ نظر یہ بھی کہا جا سکتا ہے لَيْسَ كُلُّ اِنْسَانٍ عَبْدًا لِلّٰهِ کہ ہر انسان اللہ کا بندہ نہیں ہے یعنی بندہ مخلص نہیں ہے اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں: وَالنَّاسُ كُلُّهُمْ عِبَادُ اللّٰهِ کہ تمام لوگ اللہ کے ہیں یعنی اللہ ہی نے سب کو پیدا کیا ہے۔ بلکہ تمام اشیاء کا یہی حکم ہے۔

عَبْدٌ کا لفظ جب غلام کے معنی میں استعمال ہو تو اِس کی جمع عَبِيْدٌ آتی ہے اور جب عَبْدٌ بمعنی عَابِدٌ یعنی عبادت گزار کے ہو تو اسکی جمع عِبَادٌ آتی ہے۔ البتہ مولانا عبدالرشید نعمانیؒ لغات القرآن میں فرماتے ہیں: ''میری ناقص رائے میں یہ

قاعدہ کلیہ نہیں بلکہ اکثری ہے کیونکہ خود قرآن پاک میں ایک مقام پر عِبَادٌ کا استعمال غلاموں کے معنی میں ہوا ہے، ارشاد ہے:﴿ وَ اَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَ الصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ اِمَآىِٕكُمْ ﴾(24/النور:32)''اور نکاح کرو رانڈوں کا اپنے اندر، اور جو نیک ہوں تمہارے غلام اور لونڈیاں۔'' عَبْدٌ کے بارے میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں: ''عَبْدٌ کا لفظ جب اس کی اضافت حق تعالیٰ کی جانب ہو، قریب یا مرتبہ خصوصی کو ظاہر کرنے والا ہوتا ہے۔ اور عبدنا یا عبداللہ کا استعمال محاورۂ قرآنی میں ہمیشہ لطف و رحمت ہی کے مخصوص موقعوں پر ہوا ہے۔'' مولانا مفتی محمد شفیعؒ عَبْدٌ کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''عِبَادٌ، عَبْدٌ کی جمع ہے عبد کا ترجمہ ہے بندہ جو اپنے آقا کا مملوک ہو، اس کا وجود اور اس کے تمام اختیارات و اعمال آقا کے حکم و مرضی پر دائر ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا بندہ کہلانے کا مستحق وہی شخص ہو سکتا ہے جو اپنے عقائد و خیالات کو اور اپنے ہر ارادے اور خواہش کو اور اپنی ہر حرکت و سکون کو اپنے رب کے حکم اور مرضی کے تابع رکھے ہر وقت گوش بر آواز رہے کہ جس کام کا حکم ہو وہ بجالاؤں۔'' (معارف القرآن، ج۶، ص:۵۰۲)

اُعْبُدْ ج: اُعْبُدُوْا۔ فعل امر کا صیغہ ہے۔ تم عبادت کرو۔ تم بندگی کرو۔ ﴿ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ﴾(39/الزمر:2)''پس آپ عبادت کریں اللہ کی خالص کرتے ہوئی اس کے لیے اطاعت کو۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ ﴾(2/البقرۃ:21)''اے لوگو بندگی کرو اپنے اس رب کی جس نے پیدا کیا تمہیں۔''

(تفعیل) تَعْبِيْدًا غلام بنانا۔ فرمانبردار بنانا۔ عربی زبان میں طَرِيْقٌ مُعَبَّدٌ اس ہموار راستے کو کہتے ہیں جس پر لوگ آسانی سے چل سکیں۔ اسی طرح عَبَّدْتُّ فُلَانًا کے معنی ہیں میں نے اسے مطیع کر لیا یعنی محکوم بنا لیا۔ ﴿ وَ تِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ﴾(26/الشعراء:22)''رہا تیرا احسان جو تو نے مجھ پر جتایا ہے تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا لیا تھا۔''

ع و ن

(ن) عَوْنًا پشت پناہ ہونا۔ درمیان میں ہونا۔

(افعال) اِعَانَةً پشت پناہی کرنا۔ مدد کرنا۔ ﴿ فَاَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ ﴾(18/الکہف:95)''پس میری مدد کرو قوت سے۔''

(تفاعل) تَعَاوُنًا ایک دوسرے کی مدد کرنا۔ ﴿ وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى ﴾(5/المآئدہ:2)''باہم مدد کرو نیکی اور تقویٰ پر۔''

(استفعال) اِسْتِعَانَةً مدد مانگنا۔ مدد چاہنا۔

مُسْتَعَانٌ اسم المفعول ہے۔ جس کی مدد چاہی جائے۔ جس سے مدد مانگی جائے۔ ﴿ وَ اللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴾(12/یوسف:18)''اور اللہ ہی سے مدد مانگتا ہوں اس پر جو تم لوگ بتاتے ہو۔''

عَوَانٌ ج: عُوْنٌ۔ درمیان۔ ادھیڑ عمر۔ عورتوں اور مویشیوں میں جو درمیانی عمر کا ہو اُس کو عَوَانٌ کہتے ہیں ﴿ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّ لَا بِكْرٌ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ﴾(2/البقرۃ:68)''بیشک وہ ایک گائے ہے نہ بوڑھی ہے اور نہ کنواری ہے (بلکہ) دونوں عمروں کے درمیان ہے۔''

اِسْتَعِيْنُوْا فعل امر ہے۔ تم مدد مانگو۔ ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ﴾(2/البقرۃ:153)''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، صبر اور نماز سے مدد لو۔''

ترجمہ	اِیَّاکَ	نَعْبُدُ	وَ اِیَّاکَ	نَسْتَعِیْنُ
	صرف تیری ہی	ہم عبادت کرتے ہیں	اور صرف تجھ سے ہی	ہم مدد مانگتے ہیں

نوٹ:1 بعض سلف کا قول ہے کہ اَلْفَاتِحَۃُ سِرُّ الْقُرْآنِ وَ سِرُّ الْفَاتِحَۃِ ھٰذِہِ الْکَلِمَۃُ..... یعنی قرآن کا خلاصہ یا راز سورہ فاتحہ ہے۔ اور پوری سورہ فاتحہ کا راز یا خلاصہ اس آیت اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ میں ہے۔

نوٹ:2 ''عبادت'' کی اہمیت کے پیش نظر یہاں اس کی مزید وضاحت دی جارہی ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ ''عبادت'' کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں: ''عبادت نام ہے بندگی اور اطاعت و پیروی کا جو نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، یا ذکر و تلاوت میں منحصر نہیں اور نہ یہ چیزیں اپنی ذات میں مقاصد ہیں، بلکہ ان سب کا مقصد صرف ایک حکم الٰہی کی اطاعت ہے، یہی وجہ ہے کہ جن اوقات میں نماز کی ممانعت فرمائی گئی ہے، ان میں نماز کوئی کار ثواب نہیں بلکہ اُلٹا گناہ کا موجب ہے، ایام عیدین وغیرہ جن میں روزہ رکھنا ممنوع ہے، تو اس وقت روزہ رکھنا گناہ ہے، نویں ذی الحجہ کے علاوہ کسی دن کسی مہینہ میں میدان عرفات میں جمع ہو کر دعا، عبادت کرنا کارِ ثواب نہیں جبکہ نویں ذی الحجہ میں سب سے بڑی عبادت یہی ہے اسی طرح تمام دوسری عبادات کا حال ہے جب تک ان کے کرنے کا حکم ہے تو وہ عبادت ہیں اور جب اور جس حد پر اُن کو روک دیا جائے تو وہ بھی حرام و ناجائز ہو جاتی ہیں، جاہل عوام اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہوتے، جو عبادات ان کی عادات بن جاتی ہیں بلکہ جن قومی رسوم کو وہ عبادات سمجھ کر اختیار کر لیتے ہیں، صریح احکامِ خدا اور رسول کو بھی ان کے پیچھے نظر انداز کر دیتے ہیں یہیں سے بدعات و محدثات دین کا جزو بن جاتی ہیں، جو پچھلی شریعتوں اور کتابوں کی تحریف کا سبب ہوئی ہیں، اللہ جل شانہٗ نے مختلف پیغمبروں پر مختلف کتابیں اور شریعتیں نازل فرما کر انسانوں کو یہی سکھایا ہے کہ کسی ایک عمل یا ایک قسم عبادت کو مقصود نہ بنالیں، بلکہ صحیح معنی میں اللہ کے فرمانبردار بندے بنیں، اور جس وقت پچھلے عمل کو چھوڑ دینے کا حکم ہو فوراً چھوڑ دیں، اور جس عمل کے کرنے کا ارشاد ہو فوراً اس پر عمل پیرا ہوں۔'' (معارف القرآن، ج ۳، ص: ۱۶۳) اور حضرت پیر محمد کرم شاہ صاحبؒ عبادت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''عبادت کیا ہے؟ آپ کو لغت و تفسیر کی ساری کتابوں میں اس کا یہ معنی ملے گا اَقْصٰی غَایَۃِ الْخُضُوْعِ وَالتَّذَلُّلِ یعنی حد درجہ کی عاجزی اور انکسار۔ مفسرین اس کی مثال سجدہ سے دیتے ہیں۔ حالانکہ صرف سجدہ ہی عبادت نہیں بلکہ حالت نماز میں تمام حرکات و سکنات عبادت ہیں۔ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا، رکوع اور رکوع کے بعد ہاتھ چھوڑ کر کھڑے ہونا، سجدہ اور اس کے بعد حالت التحیات میں دوزانو بیٹھنا، سلام کے لیے دائیں بائیں منہ پھیرنا، یہ سب عبادت ہیں۔ اگر عبادت صرف تذلل و انکسار کے آخری مرتبہ کا نام ہے اور یہ آخری مرتبہ سجدہ ہی ہے تو کیا یہ باقی چیزیں عبادت نہیں۔ اس کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر یہ ساری چیزیں مطلقاً عبادت ہیں تو اگر کوئی شاگرد اپنے اُستاد کے سامنے اور بیٹا اپنے باپ کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھتا ہے یا ان کی آمد پر کھڑا ہو جاتا ہے تو کیا یہ کہنا درست ہوگا کہ اُس نے اپنے اُستاد یا باپ کی عبادت کی اور اُن کو اپنا معبود بنالیا۔ حاشا وکلّا۔ پھر وہ کون سی چیز ہے جو اِن حرکات و سکنات کو اگر یہ نماز میں ہوں تو عبادت بنا دیتی ہے اور یوں کھڑے ہونے کو (ہاتھ باندھے یا کھولے ہوئے) اور اِس طرح بیٹھنے کو اور دائیں بائیں منہ پھیرنے کو تذلل و انکسار کے آخری مرتبہ پر پہنچا دیتی ہے اور اگر یہی امور نماز سے خارج ہوں تو نہ اِن میں غایۃ خضوع ہے اور نہ یہ عبادت متصور ہوتے ہیں تو اس کا ممیّز ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ جس ذات کے لیے اور جس کے سامنے آپ یہ افعال کر رہے ہیں اس کے متعلق آپ کا عقیدہ کیا ہے اگر آپ اُس کو اللہ اور معبود یقین کرتے ہیں تو یہ سب اعمال عبادت ہیں اور سب میں غایۃ تذلل و خضوع پایا جاتا ہے لیکن اگر آپ اس کو عبد اور بندہ سمجھتے ہیں تو یہ اعمال عبادت نہیں کہلائیں گے، ہاں آپ ان کو احترام، اجلال اور تعظیم کہہ سکتے ہیں۔ (ضیاء القرآن، ج ۱، ص: ۲۳) (یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ غیر اللہ کے سامنے سجدہ دو قسم کا ہو سکتا ہے۔ سجدہ عبادت اور سجدہ تعظیم۔ سجدہ عبادت تو شرک کے زمرے میں آتا ہے، سجدہ تعظیم اگرچہ شرک نہیں لیکن ناجائز و حرام وہ بھی ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مظاہر حق جدید، شرح مشکوٰۃ شریف، ج ۱، ص ۱۳۳۔ مرتب)

آیت:5

﴿ اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۙ﴾

ھ د ی

(ض) هُدًى، هِدَايَةً لطف اور مہربانی کے ساتھ رہنمائی کرنا۔ راستہ بتانا۔ اس کا استعمال ہمیشہ خیر و نیکی کے معنوں میں ہوتا ہے۔ هُدًى، دراصل مصدر هُدَیٌ تھا جو قاعدے کے مطابق هُدًى بنا۔ یہ مبنی کی طرح استعمال ہوتا ہے یعنی تینوں اعرابی حالتوں میں هُدًى ہی رہتا ہے (لیکن اس کو مبنی کہتے نہیں)۔ اس پر جب لام تعریف داخل ہو تو تینوں اعرابی حالتوں میں اَلْهُدٰى استعمال ہوتا ہے۔ ہدایت کے عموماً دو مفعول ہوتے ہیں یعنی کس کو ہدایت دی اور کیا ہدایت دی۔ هُدًى کے ساتھ دوسرے مفعول کی تین صورتیں ہیں (۱) مفعول ثانی بغیر صلہ کے آتا ہے جیسے آیت زیر مطالعہ میں ہے۔ (۲) مفعول ثانی اِلٰى کے صلہ کے ساتھ آتا ہے مثلاً ﴿وَمَنۡ يَّعۡتَصِمۡ بِاللّٰهِ فَقَدۡ هُدِىَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ۝﴾ (3/آل عمران:101) ''اور جو مضبوطی سے پکڑے گا اللہ کو تو لازماً اُس کی راہنمائی کی جائے گی ایک سیدھے راستے کی طرف۔'' (۳) مفعول ثانی ''لِ'' کے صلہ کے ساتھ آتا ہے مثلاً ﴿وَقَالُوا الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِىۡ هَدٰٮنَا لِهٰذَا﴾ (7/الاعراف:43) ''تمام تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جس نے پہنچایا ہم کو یہاں تک۔''

ہدایت کا لفظ تین معنوں میں آتا ہے:

(۱) راستہ سمجھا دینا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کام دو طرح سے کیا ہے (ا) فطری راہنمائی یا فطری ہدایت۔ جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے ساتھ ہر جاندار چیز میں ودیعت کر رکھی ہے۔ مثلاً بچے کا پیدا ہوتے ہی ماں کے پستانوں کی طرف لپکنا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿قَالَ رَبُّنَا الَّذِىۡۤ اَعۡطٰى كُلَّ شَىۡءٍ خَلۡقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ۝﴾ (20/طٰہٰ:50) ''موسیٰؑ نے جواب دیا ''ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اُس کی ساخت بخشی پھر اس کو راستہ بتایا۔'' (ب) وہ راہنمائی جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے پیغمبر بھیج کر اور کتابیں نازل کر کے کی۔ پیغمبروں نے انسانوں کے لیے اچھے اور برے راستے کی خوب اچھی طرح سے وضاحت کر دی اور نیکی اور بدی کا راستہ سمجھا دیا۔ وہ نیکی کے راستے کی طرف دعوت دیتے اور بدی کے راستے کو چھوڑنے کی تلقین کرتے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَجَعَلۡنَا مِنۡهُمۡ اَٮِٕمَّةً يَّهۡدُوۡنَ بِاَمۡرِنَا لَمَّا صَبَرُوۡا﴾ (32/السجدۃ:24) ''اور ہم نے بنی اسرائیل میں سے (دین کے) پیشوا بنائے تھے جو ہمارے حکم سے (لوگوں کو) ہدایت کرتے تھے۔'' میں ہدایت کے یہی معنی مراد ہیں۔

(۲) راستے کی درستگی پر دل کو کھول دینا یعنی توفیق دے دینا۔ یہ توفیق ہدایت یافتہ لوگوں کو عطا کی جاتی ہے ﴿وَالَّذِيۡنَ اهۡتَدَوۡا زَادَهُمۡ هُدًى وَّاٰتٰٮهُمۡ تَقۡوٰٮهُمۡ ۝﴾ (47/محمد:17) ''رہے وہ لوگ جنہوں نے ہدایت پائی ہے، اللہ اُن کو اور زیادہ ہدایت دیتا ہے اور انہیں اُن کے حصّے کا تقویٰ عطا فرماتا ہے۔'' ﴿وَمَنۡ يُّؤۡمِنۡۢ بِاللّٰهِ يَهۡدِ قَلۡبَهٗ﴾ (64/التغابن:11) ''اور جو شخص اللہ پر ایمان لاتا ہے، تو وہ اُس کے دل کو ہدایت دیتا ہے۔''

(۳) منزل مقصود تک پہنچا دینا۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَقَالُوا الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِىۡ هَدٰٮنَا لِهٰذَا﴾ (7/الاعراف:43) ''اور وہ کہیں گے کہ ''تعریف اللہ ہی کے لیے جس نے ہمیں یہ راستہ دکھایا۔'' ﴿اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهۡدِيۡهِمۡ رَبُّهُمۡ بِاِيۡمَانِهِمۡ﴾ (10/یونس:9) ''بے شک جو لوگ ایمان لائے اور اُنہوں نے نیک

عمل بھی کیے اُن کا پروردگار اُنہیں پہنچا دے گا (اُن کی منزل تک) بوجہ اُن کے ایمان کے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ) ''یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے پہنچائے گا اُنہیں اُن کا رب (منزل مقصود تک) اُن کے ایمان کے باعث۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن) سورہ یونس کی آیت نمبر 9 کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں: ''اس میں لفظ ہدایت آیا ہے جس کے مشہور معنی راستہ بتلانے اور دکھلانے کے ہیں، اور کبھی منزل مقصود تک پہنچا دینے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، اس مقام پر یہی معنی مراد ہیں اور منزل مقصود سے مراد جنت ہے جس کی وضاحت بعد کے الفاظ میں ہوگئی ہے۔''

ایک انسان کسی دوسرے کو صرف دعوت الی الخیر اور راہنمائی کے ذریعہ ہی ہدایت کر سکتا ہے باقی اقسام ہدایت اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہیں لہٰذا جن آیات میں ہدایت کی نسبت پیغمبر یا کتاب یا دوسرے انسانوں کی طرف کی گئی ہے وہاں صرف راہ حق کی طرف راہنمائی کرنا مراد ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَ اِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ (42/الشوریٰ:52) ''اور بیشک آپؐ سیدھا راستہ دکھاتے ہیں۔'' ﴿ وَّ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ﴾ (13/الرعد:7) ''اور ہر قوم کے لیے ایک ہدایت دینے والا ہے۔'' اور جن آیات میں پیغمبروں یا دوسرے لوگوں سے ہدایت کی نفی کی گئی ہے وہاں باقی اقسام ہدایت مراد ہیں چنانچہ فرمایا: ﴿ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ ﴾ (28/القصص:56) ''اے نبی ﷺ! آپؐ جسے چاہیں اسے ہدایت نہیں دے سکتے۔'' اور قرآن میں جہاں کہیں ظالموں اور کافروں کو ہدایت سے روک دینے کا ذکر آیا ہے وہاں یا تو ہدایت بمعنی توفیق خاص جو ہدایت یافتہ لوگوں کو عطا ہوتی ہے ان سے سلب کر لی جاتی ہے اور یا ہدایت بمعنی یہ کہ اللہ انہیں آخرت میں ثواب کی طرف ہدایت نہیں دے گا اور نہ ہی انہیں جنت میں داخل کرے گا چنانچہ فرمایا: ﴿ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ (9/التوبۃ:19) ''اور اللہ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔'' ﴿ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ (16/النحل:107) ''اور یہ کہ اللہ کافر لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

ویسے تو ہدایت کا استعمال ہمیشہ خیر اور نیکی کے معنوں میں ہوتا ہے لیکن قرآن مجید میں طنزاً کافروں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے ﴿ فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ ﴾ (37/الصّٰفّٰت:23) ''پھر ان سب کو جہنّم کا راستہ دکھاؤ۔'' یہ اُسی طرح ہے جیسے فرمایا: ﴿ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ (84/الانشقاق:24) ''لہٰذا! ان کو دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔'' اس میں عذاب کے لیے بشارت کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

ھدی یھدی کا صلہ جب لام آتا ہے تو اس کے معنی ظاہر ہونا، واضح ہونا، روشن ہونا بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً: ﴿ اَوَ لَمْ يَهْدِ لِلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ اَهْلِهَآ اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ ﴾ (7/الاعراف:100) ''کیا اُن لوگوں پر جو اب زمین کے وارث ہیں بعد اُس کے سابق باشندوں کے یہ بات واضح نہیں ہوئی ہے کہ اگر ہم چاہتے تو اُنہیں بھی مصیبت میں مبتلا کر دیتے اُن کے گناہوں کے عوض میں۔'' آیت کی وضاحت کرتے ہوئے صاحبؒ تفسیر ماجدی فرماتے ہیں ''ہدایۃ کا تعدیہ جب ل کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی ہوتے ہیں تَبْیِیْنٌ کے یعنی روشن و واضح ہو جانے کے۔ اِنَّمَا عُدِّیَ یَھْدِ بِاللَّامِ بِمَعْنٰی یُبَیِّنُ (بیضاویؒ)۔''

هُدًى مصدر کے علاوہ اسم ذات بھی ہے بمعنی ہدایت۔ ﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ﴾ (2/البقرۃ:16) ''یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے خرید لی گمراہی، ہدایت کے بدلے۔'' هُدًى، بمعنی اَلْهَادِیْ، ہدایت دینے والا بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کا ترجمہ بعض بزرگوں نے اسی معنی کے لحاظ سے کیا ہے۔ چنانچہ حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں: ''راہ بتلاتی ہے ڈرنے والوں کو۔'' اور صاحبؒ احسن البیان فرماتے ہیں: ''پرہیزگاروں کو راہ دکھانے والی ہے۔''

اِهْدِ ج: اِهْدُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو راہنمائی کر۔ تو ہدایت دے۔ اِهْدِ، آیت زیر مطالعہ میں استعمال ہوا ہے۔ اور ﴿ فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ ﴾ (37/الصافات:23) ''پھر ان سب کو جہنم کا راستہ دکھاؤ۔''

هُدِیَ ج: هُدُوْا۔ ماضی مجہول کا صیغہ ہے۔ اُسے ہدایت دی گئی۔ اس کی راہنمائی کی گئی۔ ﴿وَمَنْ یَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴾ (3/آل عمران:101) ''جو شخص اللہ تعالیٰ (کے دین) کو مضبوطی سے تھام لے تو بلاشبہ اُسے راہ راست دکھا دی گئی ہے۔'' ﴿وَهُدُوْٓا اِلَی الطَّیِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ﴾ (22/الحج:24) ''اُن کو پاکیزہ بات کی راہنمائی کر دی گئی۔''

هَادٍ اسم الفاعل ہے۔ راہنمائی کرنے والا۔ ﴿وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ﴾ (13/الرعد:7) ''اور ہر قوم کے لئے ایک ہدایت دینے والا ہے۔'' هَادٍ، جب مضاف ہو تو کبھی اسے 'ی' کے ساتھ لکھا جاتا ہے یعنی بِهٰدِی الْعُمْیِ (النمل:81) اور کبھی 'ی' کے بغیر لکھا جاتا ہے یعنی بِهٰدِ الْعُمْیِ (الروم:53)۔ هَادٍ کو حالت نصب میں هَادِیًا لکھا جاتا ہے (الفرقان:31)۔ هَادٍ جب لائے نفی جنس کا اسم ہو تو هَادِیَ لکھا جاتا ہے (الاعراف:186)۔

اَهْدٰی اَفْعَلُ التفضیل کا صیغہ ہے۔ اس کا ترجمہ ''زیادہ راہ پانے والا، زیادہ ہدایت یافتہ'' کیا جاتا ہے۔ ﴿وَیَقُوْلُوْنَ لِلَّذِیْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰی مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سَبِیْلًا ﴾ (4/النساء:51) ''اور وہ لوگ کافروں کے حق میں کہتے ہیں کہ وہ لوگ ایمان والوں سے زیادہ ہدایت یافتہ ہیں بلحاظ راستے کے۔''

(تفعیل) تَهْدِیَةً، تَفْعِلَةٌ کے وزن پر مصدر ہے۔ کسی چیز کو کسی تک پہنچا دینا۔ تحفہ دینا۔

هَدِیَّةٌ اسم ذات ہے۔ تحفہ۔ ﴿وَاِنِّیْ مُرْسِلَةٌ اِلَیْهِمْ بِهَدِیَّةٍ ﴾ (27/النمل:35) ''اور میں بھیجنے والی ہوں انؑ کی طرف ایک تحفہ۔''

هَدْیٌ کا لفظ خاص کر اس جانور پر بولا جاتا ہے جو بیت اللہ کی طرف (ذبح کے لیے) بھیجا جائے۔ اخفش نے اس کا واحد هَدْیَةٌ لکھا ہے۔ نر کی طرح مادہ جانور پر بھی ہدی کا لفظ بولا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ مصدر ہے۔ جو بطور صفت کے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے: ﴿فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَیْسَرَ مِنَ الْهَدْیِ ﴾ (2/البقرۃ:152) ''اور اگر کہیں گھر جاؤ تو جو قربانی میسر آئے۔'' ایسے جانور جس شخص کے پاس ہوتے تو عرب کا معمول تھا کہ اُس کو کچھ نہ کہتے اور وہ امن کے ساتھ سفر کرتا اور اپنا مقصد پورا کرتا اس لیے ہدی بھی قیام امن کا ایک سبب ہوئی۔

(افتعال) اِهْتِدَاءً ہدایت پانا۔ لیکن یہ لفظ خاص اُس ہدایت پر بولا جاتا ہے جو انسان اپنے اختیار سے حاصل کرے۔ ﴿فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ﴾ (3/آل عمران:20) ''پس اگر یہ لوگ اسلام لے آئیں تو یہ لوگ یقیناً ہدایت پائیں گے۔'' کبھی اس کے معنی طلب ہدایت کے بھی آتے ہیں مثلاً ﴿وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِیْ عَلَیْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴾ (2/البقرۃ:150) ''اور یہ بھی مقصود ہے کہ میں تم کو اپنی تمام نعمتیں بخشوں اور یہ بھی کہ تم راہ راست پر چلو۔'' اور کبھی اِس کے معنی سمجھنے کے بھی آتے ہیں مثلاً ﴿قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ اَتَهْتَدِیْٓ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِیْنَ لَا یَهْتَدُوْنَ ﴾ (27/النمل:41) اِس آیت کا ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ ان الفاظ میں کرتے ہیں: ''کہا روپ بدل دکھلاؤ اِس عورت کے آگے اُس کے تخت کا ہم دیکھیں سمجھ پاتی ہے یا اُن لوگوں میں ہوتی ہے جن کو سمجھ نہیں۔'' (واللہ اعلم)

نوٹ: قرآن مجید میں یَهْتَدِیْ کو یَهِدِّیْ بھی پڑھا گیا ہے۔ مثلاً ﴿اَفَمَنْ یَّهْدِیْٓ اِلَی الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ یُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا یَهِدِّیْٓ اِلَّآ اَنْ یُّهْدٰی ﴾ (10/یونس:35) ''پھر بھلا بتاؤ، جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے وہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جو خود راہ نہیں پاتا اِلّا یہ کہ اس کی رہنمائی کی جائے؟'' اصل میں یَهِدِّیْ قاعدے کے مطابق یَهْدِیْ بنتا ہے لیکن 'ھ' پر زیر پڑھنا بھی جائز ہے۔

مُّهْتَدٍ ج: مُهْتَدُوْنَ، مُهْتَدِيْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ ہدایت پانے والا۔ ہدایت یافتہ۔ ﴿فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝٢٦﴾ (57/الحدید:26) ''اور ان میں کوئی ہدایت پانے والا ہے اور ان میں اکثر فاسق ہیں۔'' ﴿وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۝١٥٧﴾ (2/البقرۃ:157) ''اور وہ لوگ ہی ہدایت یافتہ ہیں۔'' ﴿وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝١٦﴾ (2/البقرۃ:16) ''اور وہ ہدایت یافتہ نہ ہوئے۔'' مُهْتَدٍ اصل میں مُهْتَدِيٌ تھا جو کہ قاعدے کے مطابق مُهْتَدٍ بن گیا۔ اس پر 'ال' داخل کریں تو یہ اَلْمُهْتَدِيُ بنتا ہے جو کہ پھر 'ی' ساکن کے ساتھ اَلْمُهْتَدِیْ لکھا جاتا ہے (الاعراف:178) اور کبھی اس 'ی' کو حذف کرکے اَلْمُهْتَدِ لکھا جاتا ہے (بنی اسرائیل:97)۔

هُدًى اور هِدَايَةٌ میں فرق: اَلْهُدٰى اور هِدَايَةٌ اگرچہ لغتاً ہم معنی ہیں لیکن قرآن پاک نے هُدًى کا لفظ خاص کر ہدایت الٰہی کے لیے استعمال کیا ہے اور کسی انسان کی طرف اس کی نسبت نہیں کی چنانچہ فرمایا: ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝٢﴾ (2/البقرۃ:2) ''خدا سے ڈرنے والوں کی راہنما ہے۔'' ﴿فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ﴾ (2/البقرۃ:38) ''پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے، تو جو لوگ میری اُس ہدایت کی پیروی کریں گے۔'' ﴿قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ۭ﴾ (2/البقرۃ:120) ''صاف کہہ دو کہ راستہ بس وہی ہے جو اللہ نے بتایا ہے۔'' (مفردات القرآن)

س ر ط

(ن۔س) سَرْطًا۔ سَرَطَانًا نگلنا۔

سِرَاطٌ ج: سُرُطٌ اور صُرُطٌ۔ آسان راستہ۔ صاف کھلا راستہ۔ 'س ط' کی وجہ سے 'ص' پڑھی جاتی ہے۔ مولانا عبدالرشید نعمانی اِس لفظ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''واضح رہے کہ صِرَاطٌ اصل میں سِرَاطٌ ہے۔ اس میں س کا ص سے قلب (بدل جانا) ہے تاکہ اطباق (موٹا ہونا۔ تجوید کی اصطلاح) میں طا کے مطابق ہو جائے۔ اس کی اصل سَرَطْتُ الطَّعَامَ سے ہے جس کا استعمال کھانے کے نگلنے کے لیے ہوتا ہے گویا سراط میں اس کا تصور ہے کہ رہرو (راستہ چلنے والا) راہ کو نگل لیتا ہے یا راستہ رہرو کو ہڑپ کر جاتا ہے۔'' (لغات القرآن)

ق و م

(ن) قِيَامًا (۱) یہ مصدر ہے مطلب ہے: کھڑا ہونا۔ ٹھہرنا۔ نگرانی یا حفاظت کرنا۔ اٹھنا۔

(۲) یہ قَآئِمٌ کی جمع بھی ہے مطلب ہے کھڑے ہونے والے۔ ﴿وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ۝٦٤﴾ (25/الفرقان:64) ''اور وہ لوگ جو رات کاٹتے ہیں اپنے رب کے آگے سجدے میں اور کھڑے۔'' اس آیت میں حضرت درویشؒ نے قِيَامٌ کو قَآئِمٌ کی جمع لکھا ہے۔

(۳) یہ اسم ذات بھی ہے مطلب وہ چیز جس پر کھڑا ہوا جائے۔ جیسے کِتَابٌ وہ چیز جس پر لکھا جائے۔ جس سے کسی چیز کی بقا وابستہ ہو۔ وہ چیز جس کے سہارے کوئی قائم رہ سکے۔ قرآن مجید میں مال کو قیام اسی معنی کے لحاظ سے کہا گیا ہے۔ ﴿وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا﴾ (4/النساء:5) ''اور اپنے وہ مال جنہیں اللہ نے تمہارے لیے قیامِ زندگی کا ذریعہ بنایا ہے، نادان لوگوں کے حوالہ نہ کرو۔'' ﴿جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ﴾ (5/المائدۃ:97) ''اللہ نے مکانِ محترم کعبہ کو لوگوں کے لیے (اجتماعی زندگی کے) قیام کا ذریعہ بنایا۔''

قِيَامَةٌ مصدر ہے۔ ایک بار کھڑے ہونا۔ اچانک اٹھ کھڑے ہونا۔ اصطلاح شرع میں اس سے مراد ہے مرنے کے بعد، جزا اور سزا کے لیے، دوبارہ زندہ ہو کر قبروں سے اٹھ کھڑے ہونا۔ یہ عقیدہ اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ہے۔ ﴿وَيَوْمَ

الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ﴾(2/البقرۃ:85)''اور قیامت کے دن (یعنی دوبارہ کھڑے ہونے کے دن) وہ لوٹائے جائیں گے شدید ترین عذاب کی طرف۔''

قَائِمٌ ج: قِيَامٌ اور قَائِمُوْنَ۔ اسم الفاعل۔ کھڑا ہونے والا۔ نگرانی کرنے والا۔ قیام کرنے والا۔ ﴿اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ ؕ﴾(13/الرعد:33)''تو کیا وہ جو نگرانی کرنے والا ہے ہر نفس (کے عمل) کی جو اس نے کمایا۔''

قُمْ ج: قُوْمُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو کھڑا ہو۔ ﴿قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ﴾(73/مزمل:2)''کھڑے ہو جایئے رات کو (نماز کے لیے) مگر تھوڑا۔'' ﴿وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ۝﴾(2/البقرۃ:238)''اور کھڑے رہو اللہ کے لیے عاجزی کرتے ہوئے۔''

قَوَّامٌ فَعَّالٌ کے وزن پر مبالغہ ہے۔ بہت زیادہ حفاظت کرنے والا۔ ذمہ دار۔ کفیل۔ قَوَّامٌ اُس شخص کو کہتے ہیں جو کسی ادارے، نظام یا فرد کے معاملات کو درست حالت میں چلانے، اُس کی نگہبانی اور حفاظت کرنے اور اُس کی ضروریات مہیا کرنے کا ذمہ دار ہو۔ اِس لیے اردو میں اِس کا ترجمہ عموماً حاکم کیا جاتا ہے۔ ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ﴾(4/النساء:34)''مرد حفاظت کرنے والے، ذمہ دار ہیں عورتوں پر۔'' ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ﴾(4/النساء:135)''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، انصاف کے علم بردار اور خدا واسطے گواہ بنو۔''

قَيُّوْمٌ فَيْعُوْلٌ کے وزن پر مبالغہ ہے۔ اصل میں قَيْوُوْمٌ تھا۔ صرفی تعلیل کے بعد قَيُّوْمٌ بن گیا۔ اس کا مصدر قِيَامٌ ہے۔ اس کے معنی ہیں وہ ذات جو از خود قائم ہو اور دوسروں کو قائم رکھنے والی ہو۔ حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں: ''اَلْقَيُّوْمُ: اَلْقَائِمُ بِتَدْبِيْرِ خَلْقِهٖ مِنْ اِنْشَاءِهِمْ اِبْتِدَاءً وَاِيْصَالِ اَرْزَاقِهِمْ اِلَيْهِمْ یعنی وہ ہستی جو کائنات کی ہر چیز کی تخلیق، نشوونما اور بقاء کی تدبیر فرمانے والی ہے۔ ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ﴾(2/البقرہ:255)''اللہ، وہ زندۂ جاوید ہستی، جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے، اُس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔''

قَيِّمٌ، قَيِّمَةٌ یہ دونوں صفت کے صیغے ہیں۔ ان کا معنی ہے ایسا سیدھا جس میں ذرا بھی کجی یا ٹیڑھا پن نہیں یا ایسا صحیح جس میں ذرا بھی غلطی کا امکان نہیں۔ قائم یا ثابت چیز۔ سیدھی چیز۔ درست کرنے والا۔ ﴿ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ﴾(9/التوبۃ:36)''یہی ٹھیک ضابطہ ہے۔'' ﴿وَ ذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ۝﴾(98/البیّنۃ:5)''یہی نہایت صحیح اور درست دین ہے۔'' اَلدِّيْنُ الْقَيِّمُ کے بارے میں امام راغبؒ نے لطیف توجیہ کی ہے، فرماتے ہیں: ''ایسا دین جو معاش و معاد اور دنیا و آخرت کو درست کرنے والا ہے۔'' گویا امام راغبؒ کے نزدیک قَيِّمٌ بمعنی مُقَوِّمٌ (بابِ تفعیل سے اسم الفاعل۔ درست کرنے والا) ہے۔ (بحوالہ لغات القرآن)

اَقْوَمُ افعل التفضیل کا صیغہ ہے۔ زیادہ درست رکھنے والا۔ زیادہ قائم رکھنے والا۔ بالکل سیدھا۔ ﴿وَ اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ﴾(2/البقرۃ:282)''اور بہت درست رکھنے والا ہے گواہی کو۔'' ﴿اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ﴾(17/بنی اسرائیل:9)''بے شک یہ قرآن بتلاتا ہے وہ راستہ جو بالکل سیدھا ہے۔''

مَقَامٌ اسم الظرف ہے مَفْعَلٌ کے وزن پر۔ کھڑے ہونے کی جگہ۔ ٹھہرنے کی جگہ۔ ﴿وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ﴾(2/البقرہ:125)''اور تم لوگ بنالو ابراہیمؑ کے کھڑے ہونے کی جگہ میں سے نماز کی جگہ۔'' یہ بطور مصدر بھی استعمال ہوتا ہے۔ ﴿اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَ تَذْكِيْرِيْ﴾(10/یونس:71)''اگر تم لوگوں پر بھاری ہے میرا کھڑا ہونا اور میری نصیحت۔''

قِيَمٌ (۱) صفت ہے۔ یا (۲) قِيَامٌ کا مخفف ہے۔ مطلب ہے درست، صحیح، دنیا اور آخرت کو درست کرنے والا۔ ﴿دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۚ﴾(6/الانعام:161)''دین صحیح ملت ابراہیم کی جو ایک ہی طرف کا تھا۔''

قَوَامٌ اسم ہے۔ اسراف اور بخل کے درمیان حد اوسط، معتدل، میانہ، متوسط۔ ﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴾ (25/الفرقان:67) ''جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں نہ بخل، بلکہ اُن کا خرچ دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتا ہے۔''

قَوْمٌ کسی جگہ یا کسی صفت پر قائم رہنے والے افراد کا گروہ۔ ﴿ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴾ (2/البقرہ:118) ''ہم واضح کر چکے ہیں نشانیوں کو یقین رکھنے والے گروہ کیلئے۔''

(افعال) **اِقَامَةً، اِقَامًا** کھڑا کرنا۔ سیدھا کرنا۔ کسی چیز کو قائم و دائم رکھنا۔ ﴿ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ ﴾ (5/المآئدہ:55) ''جو لوگ نماز کو قائم رکھتے ہیں۔'' ﴿ وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ﴾ (21/الانبیاء:73) ''اور ہم نے ان کی طرف نیک کاموں کے کرنے اور نمازوں کے قائم رکھنے اور زکوٰۃ دینے کی وحی (تلقین) کی۔'' (ترجمہ احسن البیان)۔ اِقَامٌ بھی دراصل باب افعال کا مصدر اِقَامَةٌ ہے۔ تخفیف کے لیے 'ت' کو آخر سے حذف کر دیا۔

مُقِيْمٌ ج: مُقِيْمُوْنَ- اسم الفاعل ہے۔ قائم رکھنے والا۔ ﴿ وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ ﴾ (4/النساء:162) ''اور نماز کو قائم رکھنے والے۔''

مُقَامٌ، مُقَامَةٌ اسم المفعول جو بطور اسم الظرف بھی استعمال ہوتا ہے۔ کھڑا کیا ہوا۔ کھڑے کئے جانے کی جگہ۔ ٹھہرائے جانے کی جگہ۔ ﴿ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ﴾ (33/الاحزاب:13) ''تمہیں ٹھہرائے جانے کی کوئی جگہ نہیں ہے پس واپس چلو۔'' ﴿ الَّذِيْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ﴾ (35/فاطر:35) ''جس نے ہمیں اپنے فضل سے ابدی قیام کی جگہ ٹھہرا دیا۔''

اَقِمْ ج: اَقِيْمُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو قائم و دائم رکھ۔ تو سیدھا رکھ۔ ﴿ وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ﴾ (10/یونس:105) ''اور (مجھے حکم دیا گیا ہے کہ) تو اپنا رخ سیدھا رکھ اِس دین کی طرف ہر کجی سے بچتے ہوئے۔'' ﴿ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴾ (2/البقرۃ:43) ''اور قائم کرو/ قائم رکھو نماز اور ادا کرو زکوٰۃ اور رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔''

(تفعیل) **تَقْوِيْمًا** کسی چیز کی بنیاد کو درست کرنا، ٹھیک کرنا، اعتدال پیدا کرنا (تعدیل کرنا)۔ ﴿ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ﴾ (95/التین:4) ''یقیناً ہم نے پیدا کیا انسان کو سب سے اچھے تناسب و تعدیل میں۔''

(استفعال) **اِسْتِقَامَةً** اس طرح سیدھا کھڑا ہونا کہ کوئی کجی یا کسی طرف جھکاؤ نہ ہو۔ سیدھا ہونا۔ ڈٹ جانا۔ قائم رہنا۔ سیدھا چلنا۔ دین پر ڈٹ جانا اور استقامت اختیار کرنا کے معنی حضرت عمر فاروقؓ نے اِن الفاظ میں بیان کیے ہیں: ''اَلْاِسْتِقَامَةُ اَنْ تَسْتَقِيْمَ عَلَى الْاَمْرِ وَالنَّهْيِ وَاَلَّا تَرُوْغَ رَوَغَانَ الثَّعَالِبِ استقامت یہ ہے کہ تم اللہ کے تمام احکام، اوامر اور نواہی پر سیدھے جمے رہو اور یہ کہ اُس سے اِدھر اُدھر راہِ فرار لومڑیوں کی طرح نہ نکالو۔'' (بحوالہ معارف القرآن)

مُسْتَقِيْمٌ اسم الفاعل ہے۔ ہر کجی اور جھکاؤ سے پاک ہو کر سیدھا ہونے والا۔ بطور صفت بھی استعمال ہوتا ہے۔ یعنی ہر کجی اور جھکاؤ سے پاک یعنی سیدھا۔

اِسْتَقِمْ ج: اِسْتَقِيْمُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو قائم رہ۔ تو ثابت قدم رہ۔ ﴿ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ﴾ (42/الشوریٰ:15) ''تو قائم رہ جیسا کہ فرما دیا ہے تجھ کو۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔ ﴿ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ﴾ (9/التوبۃ:7) ''سو جب تک وہ قائم رہیں تمہارے لیے (معاہدہ پر) تم بھی قائم رہو اُن کے لیے۔''

ترکیب اِهْدِ ثلاثی مجرد سے فعل امر ہے۔ اِهْدِ کے دو مفعول ہوتے ہیں کس کو ہدایت دی اور کیا ہدایت دی، یہاں 'نا' ضمیر مفعولی، مفعول اول ہے اور

مفعول ثانی مرکب توصیفی الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ہے۔

ترجمہ	اِهْدِ	نَا	الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ
	تو ہدایت دے	ہم کو	سیدھے راستے کی

نوٹ۔1 اِهْدِ یہاں پر ہدایت کے جامع مفہوم میں ہے۔یعنی تو سیدھا راستہ ہمیں سمجھا دے۔اس پر چلنے کی توفیق عطا فرما اور اس پر چلا کر ہمیں منزل تک پہنچا دے۔علماء کرام اور بزرگان دین جب نماز میں یہ آیت پڑھتے ہیں تو ان کی دعا دراصل توفیق اور منزل تک پہنچنے کے لئے ہوتی ہے۔تفصیل کے لئے معارف القرآن دیکھیں۔

آیت: 6
﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ﴾

اَلَّذِيْ واحد اور **اَلَّذِيْنَ** جمع ہے۔یہ دونوں مبنی ہیں۔لیکن اس کا تثنیہ قاعدہ کے مطابق اَلَّذَانِ اور اَلَّذَيْنِ آتا ہے۔یہ بھی نوٹ کرلیں کہ اَلَّذِيْ اور اَلَّذِيْنَ ایک لام کے ساتھ لکھا جاتا ہے جبکہ اس کا تثنیہ عموماً دو لام کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔البتہ قرآن مجید کے املا پر غور کرنا ضروری ہے۔اس لئے کہ سورۃ النساء کی آیت نمبر 16 میں اَلَّذَانِ ایک لام کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔

ن ع م

(ف۔ن) **نَعْمَةً** خوشحال ہونا۔نعمت پانا۔

(س) **نُعُوْمَةً،نَعَمًا** سرسبز ہونا۔تروتازہ ہونا۔

نَعْمَةٌ اور **نِعْمَةٌ** اسم ذات ہے۔نعمت، آرام، آسائش، اچھی حالت۔﴿وَذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ اُولِي النَّعْمَةِ﴾(73/المزمل:11)''اور تو چھوڑ دے مجھ کو اور جھٹلانے والوں کو جو نعمت والے ہیں۔''﴿وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ﴾(2/البقرہ:231)''اور تم لوگ یاد کرو اللہ کی نعمت کو۔''

نَعْمَآءُ ج: **اَنْعُمٌ** اور **نِعَمٌ** ۔آرام ۔آسودگی۔اچھی حالت۔اس کا اُلٹ ضَرَّآءُ ہے۔﴿وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ﴾(11/ھود:10)''اور اگر ہم چکھائیں اس کو آرام، تکلیف کے بعد۔''﴿فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ﴾(16/النحل:112)''تو اس نے ناشکری کی اللہ کی (دی ہوئی) نعمتوں کی۔''﴿وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً ؕ﴾(31/لقمان:20)''اور پوری کردیں تم پر اپنی نعمتیں کھلی اور چھپی۔''

نَعِيْمٌ فَعِيْلٌ کا وزن ہے مطلب ہے نِعْمَةٌ كَثِيْرَةٌ۔ہمیشہ خوش حال۔ہمیشہ تروتازہ۔آرام۔راحت۔﴿اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۚ﴾(82/الانفطار:13)''بیشک نیکوکار ہمیشہ کی خوشحالی میں ہوں گے۔''﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتُ النَّعِيْمِ ۙ﴾(31/لقمان:8)''بیشک جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کئے ان کے لئے نعمتوں والے باغات ہیں۔''

نَاعِمٌ اسم الفاعل ہے۔خوش حال ہونے والا۔تروتازہ۔ہشاش بشاش۔﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ ۙ﴾(88/الغاشیہ:8)''کچھ چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے۔''

نَعَمٌ ج:**اَنْعَامٌ**۔مویشی۔چوپائے (یہ اللہ کی نعمت ہیں)۔﴿فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ﴾(5/المآئدہ:95)''تو بدلہ ہے ویسا ہی جو اس نے قتل کیا مویشی میں سے۔''چوپاؤں میں سے انعام یعنی مویشی ایسے جانوروں کو کہتے ہیں جن کے پیر

کے سُم (چوپائے کا کُھر) چرے ہوتے ہیں اور وہ کُچلیاں (کُچلی کی جمع۔نوک دار دانت) اور پنجے نہیں رکھتے اور نہ ہی انسان پر حملہ کرتے ہیں۔حیوانی غذا کی بجائے نباتاتی غذا کھاتے ہیں اور جگالی کرتے ہیں۔اصل میں نَعَمٌ کا لفظ خاص اونٹوں کے لیے بولا جاتا ہے اِس لیے کہ وہ عربوں کے لیے سب سے بڑی نعمت تھے۔اِس کی جمع انعام آتی ہے لیکن انعام میں باقی جانور مثلاً بھیڑ، بکری، گائے، بھینس، نیل گائے وغیرہ بھی شامل ہیں۔مگر ان جانوروں پر انعام کا لفظ اس وقت بولا جاتا ہے جب اِس میں اونٹ بھی شامل ہو ورنہ نہیں۔گھوڑے، گدھے، شیر، وغیرہ انعام نہیں ہیں۔شائد یہی وجہ ہے کہ سورۂ آل عمران کی آیت نمبر 14 میں گھوڑوں کو انعام میں شامل نہیں کیا گیا اور ان کا ذکر الگ کیا گیا ہے۔﴿ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَ الْبَنِيْنَ وَ الْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ وَ الْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَ الْاَنْعَامِ وَ الْحَرْثِ ؕ ﴾(3/آل عمران:14)

نِعْمَ و نِعِمَّا مدح یعنی تعریف کے الفاظ ہیں۔کیسا اچھا۔کتنا عمدہ۔﴿ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ؕ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَ نِعْمَ النَّصِيْرُ ۝۴۰ ﴾(8/الانفال:40)''پس تم لوگ جان لو کہ اللہ تمہارا حمایتی ہے تو کیسا اچھا حمایتی اور کیسا اچھا مددگار ہے۔'' ﴿ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ ﴾(2/البقرۃ:271)''اگر تم لوگ علانیہ صدقہ دو تو کیسا اچھا ہے یہ۔''

نَعَمْ ہاں۔﴿ قُلْ نَعَمْ وَ اَنْتُمْ دَاخِرُوْنَ ۝۱۸ ۚ ﴾(37/الصافات:18)''آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہیے ہاں اور تم لوگ ذلیل ہوگے۔''

(افعال) اِنْعَامًا خوش حال کرنا۔نعمت دینا۔اس کے ساتھ علیٰ کا صلہ آتا ہے۔﴿ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ ﴾(1/الفاتحہ:6)''تو نے نعمت دی جن کو۔'' اِنعام کے معنی ہیں وہ کیفیت جسے انسان لذیذ پاتا ہے پھر اس کا استعمال ان اشیاء پر ہونے لگا جو اس لذت کا سبب بنتی ہیں۔اس لفظ کا استعمال صرف انسانوں کے لیے ہوتا ہے غیر انسان کے لیے نہیں۔مثلاً عربی میں یوں نہیں کہتے اَنْعَمَ عَلَى فَرَسِهٖ اُس نے اپنے گھوڑے پر انعام کیا اور نہ ہی یہ لفظ اپنی ذات کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

(تفعیل) تَنْعِيْمًا کسی کو نعمت سے نوازنا۔﴿ فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَ نَعَّمَهٗ ۙ ﴾(89/الفجر:15)''مگر انسان کا حال یہ ہے کہ اس کا رب جب اس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اسے عزّت اور نعمت دیتا ہے۔''

ترکیب صِرَاطَ الَّذِيْنَ میں صِرَاطَ مضاف ہے اور الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کا ''بدل کل'' ہونے کی وجہ سے نصب میں ہے۔اَلَّذِيْنَ اسم موصولہ ہے، آگے جملہ فعلیہ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ اِس کا صلہ ہے اور صلہ موصولہ مل کر صِرَاطَ کا مضاف الیہ ہے۔اِس لیے حالت جر میں ہے۔اِس بات کو نوٹ کر لیں اگلی آیت میں اِس کی ضرورت پڑے گی۔

ترجمہ

صِرَاطَ الَّذِيْنَ	اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ
ان لوگوں کا راستہ	جن پر تو نے انعام کیا

نوٹ: سورۃ النساء کی آیت نمبر 69 میں اللہ تعالیٰ نے اپنے انعام یافتہ افراد کی فہرست دے دی ہے اور یہ انبیاء کرام، صدیقین، شہداء کرام اور صالحین پر مشتمل ہے۔

آیت نمبر:7

﴿ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝۷ ﴾

غَيْرُ مختلف چیز، علاوہ چیز۔قرآن مجید میں غَيْرُ کا استعمال چار طور پر ہوا ہے(۱) صرف نفی کے لیے جیسے ﴿ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ ﴾(28/القصص:50)''یعنی اللہ کی طرف سے ہدایت نہ ہونے کی صورت میں۔''﴿ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ ۝۱۸ ﴾(43/الزخرف:18)''اور جو جھگڑے میں

اپنی بات واضح نہ کرسکیں۔'' (۲) لفظ اِلَّا کی طرح صرف استثناء کے لیے ۔اس صورت میں یہ نکرہ کی صفت بن سکتا ہے۔ جیسے ﴿ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ﴾ (28/القصص:38) ''میں تونہیں جانتا کہ تمہارے لیے میرے سوا کوئی اور معبود بھی ہے۔'' ﴿ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ ﴾ (35/ فاطر:3) ''کیا اللہ کے سوا کوئی اور بھی خالق ہے۔'' ﴿ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ﴾ (11/ھود:63) ''سوتم کچھ نہیں بڑھاتے میرا سوائے نقصان کے۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) ﴿ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ ﴾ (11/ھود:101) ''اور نہیں بڑھایا اُن کے حق میں سوائے ہلاک کرنے کے۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) (۳) اصل چیز کو باقی رکھتے ہوئے صرف ظاہری شکل وصورت کی نفی کے لیے جیسے ﴿ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا ﴾ (4/النساء:56) ''جب کبھی پک جائیں گی ان کی کھالیں تو بدل کر دے دیں گے ہم اُنہیں کھالیں دوسری۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن) (۴) کسی چیز کی مکمل نفی کر کے دوسری چیز کو اس جگہ قائم کرنے کے لیے جیسے ﴿ وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ﴾ (9/التوبۃ:39) ''تمہاری جگہ اللہ دوسری قوم کو لے آئے گا۔'' ﴿ ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ ﴾ (10/ یونس:15) ''لے آیئے کوئی دوسرا قرآن اس کے علاوہ۔'' غَيْرُ کے بعد مستثنیٰ مجرور ہوتا ہے اور جب فقرے میں غیر کی تکرار کا مقصود ہو تو اس 'غَيْرُ' کی بجائے 'لَا' استعمال ہوتا ہے۔ اس کے بعد بھی مستثنیٰ مجرور ہوتا ہے۔ جیسے آیت زیر مطالعہ اور ﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ﴾ (31/لقمان:20) ''انسانوں میں سے کچھ لوگ ہیں جو اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی علم ہو، یا ہدایت، یا کوئی روشنی دکھانے والی کتاب۔''

غ ض ب

(س) **غَضَبًا** انتقام کے لیے دل میں خون کا جوش مارنا۔غضبناک ہونا۔غصہ میں ہونا۔ نبی اکرم ﷺ نے غَضَبٌ کی تعریف یوں فرمائی ہے: ((اِتَّقُوْا مِنَ الْغَضَبِ فَاِنَّهٗ جَمْرَةٌ تُوْقَدُ فِيْ قَلْبِ ابْنِ اٰدَمَ اَلَمْ تَرَوْا اِلَى انْتِفَاحِ اَوْدَاجِهٖ وَحُمْرَةِ عَيْنَيْهِ)) ''غضب سے بچو کہ وہ آگ کی چنگاری ہے جو ابن آدم کے دل میں جلتی ہے۔تم دیکھتے نہیں کہ ایسے شخص کی رگیں پھول جاتی ہیں اور آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں۔'' (بحوالہ مترادفات القرآن،ص ۶۵۲، ذرا سے لفظی فرق کے ساتھ یہ حدیث مظاہر حق جدید، شرح مشکوٰۃ شریف، ج ۴،ص ۶۱۵ پر بھی ہے)۔غضب الٰہی سے مراد عذاب اور سزا ہے۔ یہ فعل لازم ہے۔ علیٰ کے صلے کے ساتھ متعدی ہو جاتا ہے۔

غَضْبَانُ فَعْلَانُ کے وزن پر مبالغہ ہے ۔بہت زیادہ غضبناک۔ ﴿ وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰۤى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ﴾ (7/الاعراف:150) ''اور جب واپس ہوئے موسیٰؑ اپنی قوم کی طرف بہت غضبناک حالت میں اور افسوس کرتے ہوئے۔''

مَغْضُوْبٌ عَلٰى لازم افعال کا مفعول اور مجہول نہیں آتا لیکن صلے کے استعمال سے مفعول اور مجہول بن جاتا ہے۔ اسی طرح غ ض ب فعل لازم ہے۔ اِس کو متعدی بنانے کے لیے علیٰ کا صلہ استعمال ہوتا ہے۔ مَغْضُوْبٌ عَلٰى اسم المفعول ہے۔ مطلب ہے جس پر غضب کیا گیا۔ جب مفعول آئے تو مفعول کی جمع نہیں بنائی جاتی بلکہ علیٰ کے بعد واحد، تثنیہ یا جمع کا ذکر کیا جاتا ہے۔ مَغْضُوْبٌ واحد ہی رہتا ہے۔ چنانچہ جس پر غضب کیا گیا اگر وہ واحد مذکر ہو تو مَغْضُوْبٌ عَلَيْهِ کہیں گے۔ واحد مؤنث ہو تو مَغْضُوْبٌ عَلَيْهَا کہیں گے۔ علیٰ ہذا القیاس۔

(مفاعلہ) **مُغَاضَبَةً** کسی پر ناراض ہونا۔

مُغَاضِبٌ اسم الفاعل ہے۔کسی پر ناراض ہونے والا۔ ﴿ وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا ﴾ (21/الانبیاء:87) ''اور مچھلی والے کو جب چلا گیا غصہ ہو کر۔''

ض ل ل

(ض) **ضَلَالًا وَضَلَالَةً** بنیادی مفہوم ہے سیدھی راہ سے ہٹ جانا۔ یہ ہدایت کے مقابلے میں استعمال ہوتا ہے۔ راستے سے روگردانی دانستہ ہو یا بھول کر ہو،تھوڑی ہو یا زیادہ، اس کو ضلال کہتے ہیں۔ضلال کا اطلاق مندرجہ ذیل معانی پر ہوتا ہے:

(۱) گمراہ ہونا۔ راہِ حق سے بھٹک کر باطل کی طرف جانا۔ مثلاً: ﴿ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ﴾ (1/الفاتحہ:7) ''جن پر غضب نہیں کیا گیا اور جو گمراہ ہونے والے نہیں۔''

(۲) راستہ کی تلاش میں ہونا۔ حیران و پریشان ہونا۔ مثلاً: ﴿ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝ ﴾ (93/الضحیٰ:7) ''اور آپؐ کو بے خبر پایا سو راستہ بتا دیا۔'' (ترجمہ ماجدیؒ) اِس آیت کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں: ''ضال کے معنی حیران وسرگرداں کے ہیں۔ محمد رسول اللہ ﷺ دولت رسالت سے تو بعد کو مشرف ہوئے ہیں۔ اپنی قوم کی اصلاح کی فکر اور تڑپ آپ ﷺ کو بہت قبل سے تھی، اور اسی دھن میں آپ ﷺ برابر لگے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے وحی کی راہ آپ ﷺ پر کھول دی۔ اور سارے حقائق دین آپ ﷺ پر منکشف کر دیئے۔ سو ضال آپ ﷺ کو آپ ﷺ کی زندگی کے دور قبل نبوت کے اعتبار سے فرمایا، جب آپ ﷺ راہِ فلاح و اصلاح کے لیے بے چین تھے۔'' (تفسیر ماجدیؒ، ص ۱۱۷۶)

(۳) ناواقف ہونا۔ جب کوئی شخص کسی شے کی حقیقت سے ناواقف ہو تو عرب کہتے ہیں ضَلَّ عَنْهُ۔ اسی معنی میں یہ آیت ہے: ﴿ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ۝ ﴾ (2/البقرۃ:198) ''اور اِس سے قبل تم یقیناً محض ناواقفوں میں تھے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ) آیت کی تشریح کرتے ہوئے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں: ''ضالّ ہمیشہ گمراہی کے معنی میں نہیں آتا، ناواقف کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اور ضلال سے مراد احکام الٰہی سے ناواقفیت ہو سکتی ہے اور یہاں یہی مراد ہے۔'' (تفسیر ماجدیؒ، ص ۱۰۴)

(۴) گم ہونا۔ ضائع ہونا۔ نیست ہونا۔ چنانچہ عربی محاورے میں کہتے ہیں ضَلَّ الْمَآءُ فِي اللَّبَنِ۔ پانی دودھ میں گم ہو گیا۔ قرآن مجید میں ہے۔ ﴿ وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۭ ﴾ (32/السجدۃ:10) ''اور کہتے ہیں کہ بھلا جب ہم زمین میں نیست و نابود ہو گئے تو کیا کہیں پھر ہم نئے جنم میں آئیں گے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)

(۵) محبت کے معنی میں۔ جیسے فرمایا: ﴿ قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ ۝ ﴾ (12/یوسف:95) ''گھر والوں نے کہا بخدا (بابا جی) آپؑ اپنی اس پرانی محبت میں مبتلا ہیں۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ اس آیت کے تحت صاحبؒ احسن البیان فرماتے ہیں: ''ضَلَالٌ سے مراد، والہانہ محبت کی وہ وارفتگی ہے جو حضرت یعقوبؑ کو اپنے بیٹے یوسفؑ کے ساتھ تھی۔ بیٹے کہنے لگے، ابھی تک آپ اسی پرانی غلطی یعنی یوسفؑ کی محبت میں گرفتار ہیں۔ اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود یوسفؑ کی محبت دل سے نہیں گئی۔'' امام راغبؒ مفردات القرآن میں لکھتے ہیں: ''تو ان آیات (یوسف آیت 8 اور 95) میں ضلال سے مراد یہ ہے کہ وہ یوسف علیہ السلام کی محبت میں اور ان کے اشتیاق میں سرگرداں ہیں اسی طرح آیت کریمہ (یوسف آیت 30) میں بھی ضلال مبین سے والہانہ محبت مراد ہے۔'' ﴿ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝ ﴾ (93/الضحیٰ:7) ''اور آپ کو اپنی محبت میں خود رفتہ پایا تو منزل مقصود تک پہنچا دیا۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ حضرت پیر کرم شاہ صاحبؒ نے اس آیت میں ضَآلًّا کے بارے میں 6 قول نقل کیے ہیں۔ اِن میں سے چھٹا قول امام رازیؒ کا ہے چنانچہ لکھتے ہیں: ''امام رازیؒ کہتے ہیں کہ الضلال بمعنی المحبت کما فی قوله تعالیٰ انك فی ضلالك القدیم۔ یعنی یہاں ضلال سے مراد محبت ہے جس طرح سورہ یوسف کی اس آیت میں ہے۔''

(۶) غلطی کے معنی میں۔ ضلال کا لفظ نادانی، خطا یا نادانستگی کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ ﴿ قَالَ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ ۝ ﴾ (26/الشعراء:20) ''(موسیٰؑ نے) کہا واقعی میں وہ حرکت کر بیٹھا تھا اور مجھ سے نادانستہ غلطی ہو گئی تھی۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ اس آیت کے حاشیے میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں: ''ضال کے معنی ہی ہیں انجان کوئی حرکت کر بیٹھنے والا۔ ضلال کا لفظ ارادی وغیر ارادی، بڑی اور چھوٹی ہر غلطی کے لیے عام ہے۔ اور اسی لیے اس کا اطلاق ضلال انبیاء و ضلال کفار دونوں پر ہوتا ہے۔ حالانکہ اس ضلال اور اُس ضلال کے درمیان زمین و آسمان کا

فرق ہے۔'' (تفسیر ماجدیؒ، ص ۷۶۳)

(۷) غفلت یا غافل ہونا کے معنی میں۔ جیسے فرمایا: ﴿لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ۝﴾ (20/طٰہٰ:52) ''میرا رب نہ غافل ہوتا ہے نہ بھولتا ہے۔''

(۸) بھول جانے کے معنی میں۔ جیسے فرمایا: ﴿اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا﴾ (2/البقرۃ:282) ''اور اگر اُن میں سے ایک بھول جائے گی۔'' مفردات القرآن کے مطابق یہاں تَضِلَّ کے معنی بھول جانے کے ہیں۔ اور یہی وہ نسیان ہے جسے عفو قرار دیا گیا ہے۔

(۹) اس درخت کو بھی عربی میں ضلالۃ کہتے ہیں جو صحرا میں اکیلا کھڑا ہو اور آس پاس کوئی دوسرا درخت نہ ہو۔

(۱۰) ضائع ہونے کے لیے بھی ضلال کا لفظ بولا جاتا ہے۔ مثلاً کوئی چیز ناموافق اور ناسازگار حالات میں ضائع ہو رہی ہو۔

(۱۱) ہلاک ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

ضَالٌّ — ج: ضَآلُّوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ گمراہ ہونے والا۔ راستہ کی تلاش میں سرگرداں ہونے والا۔ ضال کے معنی ہی ہیں انجان کوئی حرکت کر بیٹھنے والا۔ ﴿وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ ۝﴾ (3/آل عمران:90) ''اور وہ لوگ ہی گمراہ ہونے والے ہیں۔'' ﴿وَ وَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝﴾ (93/الضحیٰ:7) ''اور اس نے پایا آپ ﷺ کو حق کی تلاش میں سرگرداں تو ہدایت دی۔''

(افعال) اِضْلَالًا — گمراہ کرنا۔ ضائع کرنا۔ ﴿وَ مَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ﴾ (4/النساء:113) ''اور وہ لوگ گمراہ نہیں کرتے مگر خود اپنے آپ کو۔'' ﴿فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝ سَيَهْدِيْهِمْ﴾ (47/محمد:4-5) ''(تو وہ ہرگز ضائع نہیں کرے گا) ان کے اعمال کو (بلکہ) وہ ان کو ہدایت دے گا۔''

مُضِلٌّ — اسم الفاعل ہے۔ گمراہ کرنے والا۔ ﴿وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ﴾ (39/الزمر:37) ''اور جس کو اللہ ہدایت دے تو اس کو گمراہ کرنے والا کوئی نہیں ہے۔''

(تفعیل) تَضْلِيْلًا — ضائع کر دینا۔ برباد کر دینا۔ ناکام بنا دینا۔ ﴿اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ۝﴾ (105/الفیل:2) ''کیا اس نے نہیں کر دیا ان کی خفیہ تدبیر کو برباد۔''

ترکیب غَيْرِ مضاف ہے اور اس کی جر بتا رہی ہے کہ یہ اَلَّذِيْنَ کا بدل ہے یا اُس کی صفت ہے جو محلاً حالت جر میں ہے۔ اَلْمَغْضُوْبِ مضاف الیہ ہے عَلَيْهِمْ جار مجرور مل کر محلاً حالت رفع میں ہیں۔ اَلْمَغْضُوْبِ کا نائب الفاعل ہونے کی وجہ سے۔ وَ عطف کا ہے اور آگے لَا زائدہ نفی کی تاکید کے لیے ہے۔ اَلضَّآلِّيْنَ عطف ہے اَلْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ پر۔

ترجمہ

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ	وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝
جن پر غضب نہیں کیا گیا	اور جو گمراہ نہیں ہوئے

نوٹ:1 سورۃ الفاتحہ کے مطالعہ سے دعا مانگنے کا سلیقہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے مانگنے سے پہلے اسکی حمد وثناء کرنی چاہیے۔ متعدد احادیث میں حضور ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کرو۔ پھر درود شریف پڑھو، اس کے بعد دعا مانگو۔

نوٹ:2 آمین غیر عربی لفظ ہے۔ اکثریت کی رائے ہے کہ یہ عبرانی لفظ ہے جس کے معنی ہیں ''اِسْمَعْ وَاسْتَجِبْ'' یعنی یا اللہ تو ہماری دعا سن اور قبول فرما (حضرت عبداللہ بن عباسؓ)۔ یہ لفظ قرآن مجید کا حصہ نہیں۔ اِس کا پڑھنا سنت سے ثابت ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ البقرہ

آیت: 1-2

﴿ الٓمّٓ ۚ﴿۱﴾ ذٰلِكَ الۡكِتٰبُ لَا رَيۡبَ ۛۚ فِيۡهِ ۛۚ هُدًى لِّلۡمُتَّقِيۡنَ ۙ﴿۲﴾ ﴾

الٓمّٓ یہ حروف مقطعات ہیں۔ یہ پڑھنے میں پوری آواز کے ساتھ ادا کیے جاتے ہیں۔ ہمارے بزرگوں نے اِن حروف پر کافی کچھ لکھا ہے جو کتب تفاسیر میں سے دیکھا جا سکتا ہے البتہ اِن حروف کے بارے میں حرف آخر یہ ہے کہ هٰذَا سِرٌّ بَيۡنَ اللّٰهِ وَ رَسُوۡلِهٖ یہ وہ راز ہے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے درمیان ہے۔ امام رازیؒ تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں: اِنَّ هٰذَا عِلۡمٌ مَسۡتُوۡرٌ وَسِرٌّ مَحۡجُوۡبٌ اِسۡتَأۡثَرَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَ تَبَارَكَ بِهٖ ''بے شک یہ چھپا ہوا علم ہے، اور حجاب میں راز ہے جو اللہ کے ساتھ خاص ہے۔'' حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم اور شعبیؒ، سفیان ثوریؒ، ربیع بن خیثمؒ وابوحاتمؒ وغیرہ سب کا یہی مذہب ہے۔ (قرطبی وابن کثیر، بحوالہ تفسیر ماجدیؒ)

ذٰلِكَ یہ اشارہ بعید ہے۔ اس آیت میں اس سے کیا مراد ہے وہ آگے نوٹ 1 میں دیکھیں۔

ك ت ب

(ن) **كَتۡبًا اور كِتَابًا** کھال یا چمڑے کے دو ٹکڑوں کو باہم ملا کر سی دینا، جوڑ دینا۔ اسی بنیادی لغوی مفہوم سے پھر یہ لفظ مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ (۱) حروف کو باہم ملا دینا۔ یہ کام بذریعہ تقریر بھی ہوتا ہے۔ اسی لیے کلام اللہ کو اس وقت بھی کتاب کہا گیا جب قرآن مجید باقاعدہ ضبط تحریر میں نہیں آیا تھا۔ ﴿ ذٰلِكَ الۡكِتٰبُ لَا رَيۡبَ ۛۚ فِيۡهِ ۛۚ ﴾ (2/البقرۃ:2) اور یہ کام بذریعہ تحریر بھی ہوتا ہے جسے لکھنا کہتے ہیں۔ ﴿ وَ رُسُلُنَا لَدَيۡهِمۡ يَكۡتُبُوۡنَ ﴿۸۰﴾ ﴾ (43/الزخرف:80) ''اور ہمارے رسول یعنی فرشتے ان کے پاس لکھتے ہیں۔'' (۲) پختہ ارادہ کرنا۔ حتمی فیصلہ کرنا۔ ﴿ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغۡلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِىۡ ؕ ﴾ (58/المجادلۃ:21) ''اللہ تعالیٰ لکھ چکا ہے کہ بے شک میں اور میرے رسول ہی غالب رہیں گے۔'' (۳) لازم کرنا۔ فرض کرنا۔ ان معنوں میں عَلٰی کا صلہ آتا ہے۔ ﴿ كَتَبَ رَبُّكُمۡ عَلٰى نَفۡسِهِ الرَّحۡمَةَ ۙ ﴾ (6/الانعام:54) ''لازم کیا تمہارے رب نے اپنے آپ پر رحمت کو۔'' ﴿ كُتِبَ عَلَيۡكُمُ الصِّيَامُ ﴾ (2/البقرۃ:183) ''فرض کیا گیا تم لوگوں پر روزہ۔'' (۴) جمانا، نقش کرنا، ثبت کرنا۔

كِتَابٌ ج: كُتُبٌ۔ اسم ذات بھی ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے مثلاً،

(۱) کتاب یا لکھی ہوئی چیز۔ ﴿ يَسۡـَٔلُكَ اَهۡلُ الۡكِتٰبِ اَنۡ تُنَزِّلَ عَلَيۡهِمۡ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ ﴾ (4/النساء:153) ''مطالبہ کرتے ہیں آپ ﷺ سے اہل کتاب کہ آپ ﷺ اتروا دیں اُن پر کتاب آسمان سے۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن) ﴿ وَمَاۤ اَهۡلَكۡنَا مِنۡ قَرۡيَةٍ اِلَّا وَ لَهَا كِتَابٌ مَّعۡلُوۡمٌ ﴿۴﴾ ﴾ (15/الحجر:4) ''اور کوئی بستی ہم نے غارت نہیں کی مگر اُس کا وقت لکھا ہوا تھا مقرر۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)

(۲) قانون الٰہی۔ ﴿ وَلَا تَعۡزِمُوۡا عُقۡدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبۡلُغَ الۡكِتٰبُ اَجَلَهٗ ؕ ﴾ (2/البقرۃ:235) ''اور نہ ارادہ کرو نکاح کا یہاں تک کہ پہنچ جاوے عدت مقررہ اپنی انتہا کو۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) ﴿ لَوۡلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمۡ

فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۶۸﴾ (8/الانفال:68) ''اگر اللہ ہی کا ایک قانون پہلے سے نہ ہوتا تو جو امر تم نے اختیار کیا اُس کے بارہ میں تم پر کوئی سخت سزا نازل ہوتی۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)

(۳) اللہ تعالیٰ کا وہ رجسٹر جس میں ہر چیز محفوظ ہے یعنی لوحِ محفوظ۔ ﴿وَ عِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ ﴿۴﴾﴾ (50/قٓ:4) ''اور ہمارے پاس تو (پورا) رجسٹر (ہی) محفوظ ہے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ تفسیر عثمانیؒ میں آیت کے اس حصے کی وضاحت یوں کی گئی ہے: ''یعنی یہ نہیں کہ آج سے معلوم ہے بلکہ ہمارا علم قدیم ہے حتیٰ کہ اُن میں قبل وقوع ہی سب اشیاء کے سب حالات ایک کتاب میں جو ''لوح محفوظ'' کہلاتی ہے لکھ دیئے تھے اور اب تک ہمارے پاس وہ کتاب موجود چلی آتی ہے۔'' ﴿اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ ؕ﴾ (22/الحج:70) ''یہ سب لکھا ہوا ہے کتاب میں۔'' اس آیت میں کتاب سے مراد لوح محفوظ ہے (عثمانیؒ)

(۴) خط اور پیغام۔ ﴿قَالَتْ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّيْٓ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ ﴿۲۹﴾﴾ (27/النمل:29) ''(بلقیس) نے کہا اے اہل دربار میرے پاس ایک معزز خط ڈالا گیا ہے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)

(۵) احکام الٰہی، احکام۔ ﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ ؕ﴾ (2/البقرۃ:129) ''اے ہمارے پروردگار اِن میں ایک پیغمبر اُنہی میں سے بھیج جو اُنہیں تیری آیتیں پڑھ کر سنائے اور اُنہیں کتاب (الٰہی) اور دانائی کی تعلیم دے اور اُنہیں پاک (وصاف) کرے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ اس آیت مبارکہ میں اور البقرۃ 151، آل عمران 164، الجمعہ آیت 2 میں کتاب سے عام طور پر احکام الٰہیہ مراد لیے گئے ہیں۔ واللہ اعلم۔ ﴿فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ﴿۳﴾ ؕ﴾ (98/البینۃ:3) ''جن میں لکھی ہوں سچی اور درست باتیں۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ آیت میں کتاب سے مراد احکام ہیں۔ (بحوالہ ضیاء القرآن)

(۶) لوگوں کے اعمال نامے۔ ﴿وَ يَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّ لَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا ۚ﴾ (18/الکہف:49) ''اور کہہ رہے ہوں گے کہ ہائے ہماری کم بختی! یہ کیسی کتاب ہے کہ ہماری کوئی چھوٹی بڑی حرکت ایسی نہیں رہی جو اس میں درج نہ ہوگئی ہو۔'' (ترجمہ تفہیم القرآن) ﴿وَ وُضِعَ الْكِتٰبُ وَ جِايْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۶۹﴾﴾ (39/الزمر:69) ''کتابِ اعمال لاکر رکھ دی جائے گی، انبیاء اور تمام گواہ حاضر کر دیے جائیں گے، لوگوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا اُن پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔'' (ترجمہ تفہیم القرآن)

(۷) اللہ تعالیٰ کا اتارا ہوا کلام۔ اس معنی کے لحاظ سے کبھی تو کتاب کا اطلاق بطور اسمِ جنس تمام آسمانی کتابوں پر ہوتا ہے جیسے فرمایا ﴿هَآاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَ لَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ﴾ (3/آل عمران:119) ''تم ان سے محبت رکھتے ہو مگر وہ تم سے محبت نہیں رکھتے، حالانکہ تم تمام کتبِ آسمانی کو مانتے ہو۔'' (ترجمہ تفہیم القرآن) یا فرمایا ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ﴾ (3/آل عمران:23) ''کیا آپ ﷺ نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب الٰہی سے حصہ دیا گیا تھا اُنہیں کتاب اللہ کی طرف بلایا جاتا ہے کہ وہ اُن کے درمیان فیصلہ کرے۔'' اس آیت میں اَلْكِتٰبِ اور كِتٰبِ اللّٰهِ کی وضاحت کرتے ہوئے صاحب تفسیر ماجدیؒ فرماتے ہیں: ''الکتاب یہاں بطور اسم جنس استعمال ہوا ہے۔ یعنی کتاب الٰہی اپنے عمومی وکلی مفہوم میں۔ اور اسی کا ایک جزء توریت ہے۔ كِتٰبِ اللّٰهِ اسی عمومی وکلی کتاب کا دوسرا جزء قرآن ہے اور وہی یہاں مراد ہے۔'' کبھی اس کا اطلاق تورات پر ہوتا ہے جیسے فرمایا ﴿وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ﴾ (2/البقرۃ:53) ''اور جب ہم نے دی موسیٰؑ کو کتاب۔'' کبھی اس کا اطلاق انجیل پر ہوتا ہے جیسے فرمایا ﴿قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ۖ اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَ جَعَلَنِيْ نَبِيًّا ﴿۳۰﴾﴾

(19/مریم:30)''وہ بولا میں بندہ ہوں اللہ کا مجھ کو اُس نے کتاب دی ہے اور مجھ کو اُس نے نبی کیا۔'' کبھی اِس کا اطلاق مجموعہ صحائف انبیاء بنی اسرائیل پر ہوتا ہے جیسے فرمایا﴿ وَ قَالَتِ الْیَهُوْدُ لَیْسَتِ النَّصٰرٰی عَلٰی شَیْءٍ ۖ وَّ قَالَتِ النَّصٰرٰی لَیْسَتِ الْیَهُوْدُ عَلٰی شَیْءٍ ۙ وَّ هُمْ یَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ ﴾(2/البقرۃ:113)''اور یہود کہتے ہیں کہ نصاریٰ کسی بنیاد پر نہیں اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہود کسی بنیاد پر نہیں درآنحالیکہ وہ سب (ایک ہی) کتاب (آسمانی) پڑھتے ہیں۔'' تفسیر ماجدیؒ کے مطابق آیت میں الکتاب سے مراد مجموعہ صحائف انبیاء بنی اسرائیل مراد ہے جس کو آج عہد نامہ عتیق کہتے ہیں۔ کبھی اِس کا اطلاق قرآن مجید سے پہلے نازل ہونے والی تمام کتب سماویہ پر ہوتا ہے جیسے فرمایا﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ ﴾(4/النساء:136)''اے ایمان والو! اللہ اور اُس کے رسول ﷺ اور اُس کتاب پر ایمان لاؤ جو اُس نے اپنے رسول ﷺ پر نازل کی ہے اور اُس (جنس) کتاب پر بھی جو وہ اُس سے قبل نازل کر چکا ہے۔'' اس آیت میں وَ الْكِتٰبِ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ کی وضاحت کرتے ہوئے صاحب تفسیر ماجدیؒ فرماتے ہیں:''(الْكِتٰبِ) سے مراد یہاں جنس کتاب ہے۔ یعنی ان کتابوں پر ایمان لایا جائے جو قرآن سے قبل نازل ہو چکی ہیں۔'' اور کبھی اِس کا اطلاق قرآن مجید پر ہوتا ہے جیسے فرمایا﴿ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ ۛۚ فِیْهِ ۛۚ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ۙ﴾(2/البقرۃ:2)''یہ کتاب (کہ) کوئی شبہ اِس میں نہیں، ہدایت ہے اللہ سے ڈر رکھنے والوں کے لیے۔'' قرآن مجید کی اصطلاح میں اہل کتاب سے یہود اور نصاریٰ مراد ہیں۔ یہود کو تورات دی گئی اور نصاریٰ کو انجیل دی گئی۔

(۸) تحریری معاہدہ یعنی مُكَاتَبَةٌ۔﴿وَ الَّذِیْنَ یَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ ﴾(24/النور:33)''اور تمہارے مملوکوں میں سے جو مکاتبت کی درخواست کریں ان سے مکاتبت کرلو۔'' (ترجمہ تفہیم القرآن)

(۹) تقدیر کا لکھا یا قسمت میں جو کچھ لکھا ہے۔﴿ اُولٰٓىِٕكَ یَنَالُهُمْ نَصِیْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ ؕ﴾(7/الاعراف:37)''اُنہیں مل جائے گا اُن کا حصہ جو اُن کی قسمت میں لکھا ہے۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)

مَكْتُوْبٌ اسم المفعول ہے۔ لکھا ہوا۔ یعنی وہ عبارت جو ضبط تحریر میں لائی گئی یا وہ آواز جو ریکارڈ کی گئی۔﴿یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِیْلِ﴾(7/الاعراف:157)''وہ لوگ پائیں گے اس کو لکھا ہوا اپنے پاس توراۃ اور انجیل میں۔''

كَاتِبٌ اسم الفاعل ہے۔ لکھنے والا۔﴿وَ لَا یَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ یَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ﴾(2/البقرۃ:282)''اور انکار نہ کرے کوئی لکھنے والا کہ وہ لکھے جیسا کہ اس کو سکھایا اللہ نے۔''

اُكْتُبْ فعل امر ہے۔ تو لکھ۔﴿ اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاكْتُبُوْهُ ؕ﴾(2/البقرۃ:282)''جب بھی تم لوگ آپس میں کوئی ادھار کا معاملہ کرو ایک مقررہ مدت کے لیے تو اسے لکھ لو۔''

(مفاعلہ) مُكَاتَبَةً باہم خط و کتابت کرنا۔ تحریری معاہدہ کرنا۔ مکاتبت کے لفظی معنی تو ہیں ''لکھا پڑھی'' مگر اصطلاح میں یہ لفظ اس معنی میں بولا جاتا ہے کہ کوئی غلام یا لونڈی اپنی آزادی کے لیے اپنے آقا کو ایک معاوضہ ادا کرنے کی پیشکش کرے۔ اور جب آقا اسے قبول کرلے تو دونوں کے درمیان شرائط کی لکھا پڑھی ہو جائے (تفہیم القرآن)۔ معاوضہ کو ''بدلِ کتابت'' اور معاہدہ کرنے والے غلام کو مُكَاتَبٌ کہتے ہیں۔ معاوضہ مال کی صورت میں بھی ہوسکتا ہے اور مالک کے لیے کوئی خاص خدمت سر انجام دینے کی صورت میں بھی ہوسکتا ہے۔

كَاتِبْ فعل امر ہے۔ تو خط و کتابت کر۔ تو تحریری معاہدہ کر۔﴿ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِیْهِمْ خَیْرًا ۖ﴾(24/النور:33)''تو تم

لوگ تحریری معاہدہ کروان سے، اگر تم لوگ جانتے ہو ان میں کوئی بھلائی۔''

(افتعال) اِكْتِتَابًا گھڑ کے لکھنا۔ کسی سے لکھوانا۔ ﴿ وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا ﴾(25/الفرقان:5)''اور کفار نے کہا یہ تو افسانے ہیں پہلے لوگوں کے، اِس شخص نے لکھوالیا ہے انہیں۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)

د ی ب

(ض) رَيْبًا کسی کا کسی کو شک میں ڈالنا۔

رَيْبٌ شک۔ شبہ (یہ مصدر ہے لیکن بطور اسم ذات بھی استعمال ہوتا ہے)۔ رَيْبٌ ایسے تردّد اور وہم کو کہتے ہیں جس کی کوئی بنیاد نہ ہو اور ذرا غور کرنے سے ختم ہو جائے۔ وہ شک یا گمان جس کی حقیقت بعد میں اس کے برخلاف منکشف ہو جائے۔ رَيْبٌ کا استعمال جب مَنُوْنٌ (زمانہ) کے ساتھ ہو تو اس سے گردش زمانہ یا حوادث زمانہ مراد ہوتا ہے۔ کیونکہ زمانہ کی گردشوں کی تعین اوقات میں شک رہتا ہے کہ خدا جانے کب گردش کا وقت آ جائے، اس لیے یہ معنی مراد لیے جاتے ہیں۔ انسان کی زندگی کا سب سے بڑا حادثہ یا گردش، انسان کی موت ہوتی ہے اس لیے رَيْبَ الْمَنُوْنِ سے حادثہ موت بھی مراد لی جاتی ہے۔ حادثہ موت میں رَيْبٌ یعنی شک سے یہ مراد نہیں کہ موت واقع ہونے میں شک وشبہ ہے بلکہ اس لحاظ سے رَيْبٌ کہا جاتا ہے کہ موت کا وقت طے نہیں، اس لیے انسان تردّد میں رہتا ہے کہ نہ جانے کب موت کا وقت آ جائے۔ عربی زبان میں رَيْبَ الْمَنُوْنِ کا محاورہ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب کوئی شخص کسی دوسرے کے برے انجام کا منتظر ہو۔ ﴿ اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ۝ ﴾(52/الطور:30)''کیا کہتے ہیں یہ شاعر ہے ہم منتظر ہیں اُس پر گردش زمانہ کے۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔ پھر رَيْبٌ کا لفظ ذہنی اضطراب، تہمت یا سوءِ ظن کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ واللہ اعلم۔

رِيْبَةٌ شک۔ شبہ۔ ﴿ لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِيْ بَنَوْا رِيْبَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ ﴾(9/التوبۃ:110)''ہمیشہ رہے گا، ان کی عمارت سے جو انہوں نے بنائی، شبہ ان کے دلوں میں''

(افعال) اِرَابَةً کسی کا کسی کو شک میں ڈالنا، تہمت لگانا، بے قرار کرنا، بے چین کرنا، الجھن میں ڈالنا۔

مُرِيْبٌ اسم الفاعل ہے۔ (۱) شک کرنے والا (جو خود بھی شک میں مبتلا ہو اُسے بھی مریب کہتے ہیں) (۲) شک میں ڈالنے والا۔ (۳) بے چین کرنے والا۔ ﴿ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيْبِ ۝ ﴾(50/ق:25)''بھلائی سے روکنے والا، حد سے بڑھنے والا، شبہ ڈالنے والا۔'' ضیاء القرآن کے مطابق اس آیت میں مریب دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے یعنی شک کرنے والا بھی اور شک میں ڈالنے والا بھی۔

(افتعال) اِرْتِيَابًا شک کرنا۔ شبہ میں پڑنا۔ ﴿ وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ ﴾(57/الحدید:14)''لیکن تم لوگوں نے خود کو فتنہ میں مبتلا کیا، گومگو میں رہے اور شبہ میں پڑے۔''

مُرْتَابٌ اسم الفاعل ہے۔ شک کرنے والا۔ ﴿ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابُ ۝ ﴾(40/المؤمن:34)''اس طرح اللہ گمراہ کرتا ہے اس کو جو ہے اسراف کرنیوالا شک کرنے والا۔''

هُدًى (ھ د ی): الفاتحہ آیت 5 دیکھیں۔

و ق ی

(ض) وِقَايَةً، وِقَاءً کسی کو تکلیف یا نقصان سے بچانا (یہ فعل ثلاثی مجرد میں متعدی ہے)۔ ﴿ وَوَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ۝ ﴾(52/الطور:18)''اور ان کو بچایا ان کے رب نے دوزخ کے عذاب سے۔''

تَقِ یہ واحد مذکر مخاطب میں مضارع تَتَّقِیْ تھا۔ مجزوم ہونے کی وجہ سے ''ی'' گر گئی۔ ﴿وَمَنْ تَقِ السَّيِّاٰتِ يَوْمَىِٕذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ ؕ﴾(40/المؤمن:9)''اور جس کو تو نے بچایا برائیوں سے اس دن تو یقیناً تو نے رحمت کی اس پر۔''

قِ فعل امر ہے۔تو بچا۔اس کی گردان قِ- قِيَا- قُوْا- قِيْ- قِيَا- قِيْنَ آتی ہے۔ ﴿وَ قِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝﴾ (2/البقرہ:201)''اور تو بچا ہم کو آگ کے عذاب سے۔''

وَاقٍ اسم الفاعل ہے۔بچانے والا۔﴿وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ۝﴾(13/الرعد:34)''اور نہیں ہے ان کے لئے اللہ سے کوئی بھی بچانے والا۔''

(افتعال) **اِتِّقَاءً** نقصان یا تکلیف سے بچنا۔ پرہیز کرنا۔اصطلاحاً ہر اس چیز سے بچنا جو اللہ کی ناراضگی کا باعث ہو۔(یہ فعل باب افتعال میں لازم ہے)۔﴿وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۫﴾(4/النساء:77)''اور آخرت بہتر ہے اس کے لئے جو اللہ کی ناراضگی سے بچا۔'' اِتَّقٰی فُلَانٌ بِكَذَا کا مطلب ہے کسی چیز کو کسی دوسری چیز سے بچنے کے لیے ذریعہ بنانا، جس چیز کو بچنے کا ذریعہ بنایا جائے اس پر 'بِ' کا صلہ داخل ہوتا ہے، جیسے الزمر آیت 24 میں فرمایا ﴿يَّتَّقِيْ بِوَجْهِهٖ﴾ یعنی وہ سخت عذاب سے بچنے کے لیے اپنے چہرے کو ڈھال بناتا ہے۔

يَتَّقِ مضارع مجزوم ہے شرط ہونے کی وجہ سے۔﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝﴾(65/الطلاق:2)''اور جو بچتا ہے اللہ کی ناراضگی سے تو اللہ بناتا ہے اس کے لئے نکلنے کا راستہ۔''

اِتَّقِ فعل امر ہے۔تو بچ۔﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ﴾(2/البقرہ:206)''اور جب کہا جائے اس سے کہ تو بچ اللہ کی ناراضگی سے۔''

مُتَّقُوْنَ اسم الفاعل جمع کا صیغہ ہے۔ بچنے والے۔﴿وَ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝﴾(2/البقرہ:177)''اور وہ لوگ ہی بچنے والے ہیں اللہ کی ناراضگی سے۔''

اَتْقٰى افعل التفضیل ہے۔دوسروں سے یا سب سے زیادہ اللہ کی ناراضگی سے بچنے والا۔ پرہیز گار۔﴿وَ سَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ۝﴾(92/اللیل:17)''اور دور کیا جائے گا اس سے یعنی آگ سے زیادہ پرہیز گار کو۔''

اَلتَّقْوٰى پرہیزگاری۔بچنا۔تقویٰ۔اِتَّقٰی سے اسم ہے۔لغت میں تو تقویٰ کے معنی ہیں نفس کو اس چیز سے بچانا اور حفاظت میں رکھنا کہ جس سے خوف ہو(جَعَلُ النَّفْسِ فِيْ وِقَايَةٍ مِّمَّا يَخَافُ)۔عرف شرع میں ''تقویٰ'' نفس کو ہر اس چیز سے بچانے کا نام ہے جو گناہ کی طرف لے جائے۔(لغات القرآن ج ۲ ص ۱۷۰)۔مولانا عبدالماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں ''تقویٰ الٰہی سے مراد یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے احکام کی پابندی زندگی کے ہر ہر شعبہ میں بلا استثناء رکھی جائے۔'' تقویٰ پر مزید تفصیل آگے نوٹ 3 میں دیکھیں۔﴿وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى ۠﴾(5/المائدہ:2)''اور باہم تعاون کرو نیکی اور پرہیزگاری میں۔''

تُقَاةٌ (۱)اسم ذات ہے۔ پرہیزگاری۔﴿اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ﴾(3/آل عمران:102)''تم لوگ اللہ کی ناراضگی سے بچو جیسا کہ حق ہے اس کی ناراضگی سے بچنے کا۔''(۲)وَقٰی يَقِيْ کا مصدر بھی استعمال ہوتا ہے۔

تَقِيٌّ صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔باب افتعال میں فاکلمہ کی ''وَ'' کو ''ت'' میں تبدیل کر دیتے ہیں۔اس لئے فَعِيْلٌ کے وزن پر وَقِيٌّ کے بجائے تَقِيٌّ اسم الفاعل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ہمیشہ اور ہر حال میں اللہ کی ناراضگی سے بچنے والا۔﴿تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا ۝﴾(19/مریم:63)''یہ وہ جنت ہے جس کا ہم وارث

بنائیں گے اپنے بندوں میں سے اس کو جو تقویٰ پر دوام کرنے والا تھا۔''

لَا رَیْبَ سورۃ الفاتحہ میں آپ لفظ اَلْحَمْدُ میں لام استغراق پڑھ چکے ہیں، جو مذکورہ چیز کی تمام جنس اور ہر شکل وصورت کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔اب نوٹ کریں کہ رَیْبَ کے ساتھ جو لَا ہے یہ لائے نفی جنس ہے، جو مذکورہ چیز کی تمام جنس اور شکل وصورت کی نفی کرتا ہے۔اس کی پہچان یہ ہے کہ اپنے اسم کو نصب دیتا ہے اور اس کی تنوین کو ختم کرتا ہے اور واحد آتا ہے۔اس لئے لَا رَیْبَ میں ہر قسم کے شک کی نفی شامل ہے۔

ترکیب آیت نمبر2 کی ایک سے زیادہ ترکیبیں ممکن ہیں اور کی بھی گئی ہیں۔اس کی ایک سادہ اور عام فہم ترکیب یہ ہے کہ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ مرکب اشاری اور مبتداء ہے، لَا رَیْبَ فِیْهِ، پورا جملہ اس کی خبر اوّل ہے۔اس میں لَا، لائے نفی جنس ہے اور رَیْبَ اس کا اسم اور فِیْهِ قائم مقام خبر ہے۔آگے هُدًى خبر ثانی ہے اور لِّلْمُتَّقِیْنَ متعلق خبر ہے۔هُدًى مصدر ہے اور یہاں بمعنی هَادٍ (ہدایت دینے والا) ہے۔واللہ اعلم۔

ترجمہ	الٓمّٓ ﴿۱﴾	ذٰلِكَ الْكِتٰبُ	لَا رَیْبَ ۛ فِیْهِ ۛ	هُدًى	لِّلْمُتَّقِیْنَ ﴿۲﴾
البقرۃ:1-2	الف لام میم	یہ کتاب	کوئی شک نہیں ہے اس میں	ہدایت ہے	تقویٰ اختیار کرنے والوں کیلئے

نوٹ-1 ذٰلِكَ اشارہ بعید ہے۔اس لحاظ سے ذٰلِكَ الْكِتٰبُ کا ترجمہ ''وہ کتاب'' ہونا چاہیے۔لیکن عام طور پر اس کا ترجمہ یہ ''کتاب'' کیا جاتا ہے۔اس کی وضاحت حضرت عبدالماجد دریابادیؒ ان الفاظ میں کرتے ہیں ''ذٰلِكَ اسم اشارہ ہے۔اور اشارۂ بعید کا ترجمہ اردو میں ''وہ'' سے کیا جاتا ہے۔لیکن بُعد ہمیشہ بُعد مکان یا بُعد زمان ہی نہیں ہوتا۔بُعد منزلت وعلوئے مرتبت بھی بُعد ہی کی قسمیں ہیں۔اور هٰذَا کے مقابلہ میں ذٰلِكَ اسی بلندیٔ منزلت کے اظہار کے لیے آتا ہے۔'' (تفسیر ماجدیؒ،ص۶)۔پیر کرم شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں ''ذٰلِكَ اگرچہ عام طور پر اُس مشارٌ الیہ کے لیے استعمال ہوتا ہے جو دُور ہو لیکن ایسے مشارٌ الیہ کے لیے بھی یہ استعمال ہوتا ہے جو حساً تو نزدیک ہو لیکن اپنی شان اور رُتبہ کے اعتبار سے بہت بلند اور دسترس سے دُور ہو۔اس لیے ترجمہ میں قربِ حسی اور بُعدِ رتبی دونوں کا لحاظ رکھتے ہوئے ترجمہ کیا گیا ہے ''یہ ذی شان کتاب'' (ضیاء القرآن، ج۱،ص۲۹)

رُتبہ کی بلندی ظاہر کرنے کے لئے اشارہ بعید کے استعمال کی قرآن مجید میں ذٰلِكَ الْكِتٰبُ کے علاوہ اور بھی متعدد مثالیں ہیں۔جیسے ﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا﴾ (2/البقرہ:187) ﴿تِلْكَ اٰیٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَیْكَ بِالْحَقِّ﴾ (2/البقرہ:252) ﴿وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ﴾ (29/العنکبوت:43) لیکن سورۃ یوسف کی آیات (31-32) میں اس کا فوری تقابل سامنے آتا ہے۔حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق عزیزِ مصر کی بیوی کے رویہ کی جب شہرت ہوئی اور شہر کی خواتین نے اس پر ملامت کی، تو اس نے خواتین کو بلایا اور یوسف علیہ السلام کو ان کے سامنے کیا۔ان کی شکل وصورت کی خوبی کی تعریف میں انہوں نے کہا یہ کوئی بشر نہیں ہے۔لیکن چونکہ وہ یوسف علیہ السلام کے کردار کی بلندی سے واقف نہ تھیں، اس لئے ان کے قول میں اشارہ قریب استعمال ہوا۔مَا هٰذَا بَشَرًا۔عزیزِ مصر کی بیوی نے جواب میں کہا کہ یہ ہے جس کے متعلق تم مجھے ملامت کرتی ہو۔چونکہ اسے یوسف علیہ السلام کی عظمت کا تجربہ تھا، اس لیے اس کے قول میں اشارہ بعید آیا۔ فَذٰلِكُنَّ الَّذِیْ لُمْتُنَّنِیْ فِیْهِ۔ مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں ''لفظ ذٰلِكَ کسی دُور کی چیز کی طرف اشارے کے لیے آتا ہے اور کِتَابٌ سے مراد قرآن کریم ہے، رَیْب کے معنی شک وشبہ، معنی یہ ہیں کہ یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شک وشبہ نہیں، یہ موقع بظاہر اشارۂ بعید کا نہیں تھا، کیونکہ اِسی قرآن کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جو لوگوں کے سامنے ہے، مگر اشارۂ بعید سے اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ سورۂ فاتحہ میں جس صراطِ مستقیم کی درخواست کی گئی تھی یہ سارا قرآن اس درخواست کا جواب بصورتِ قبولیت اور صراطِ مستقیم کی تشریح وتفصیل ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ہم نے یہ دعا سن لی اور قرآن بھیج دیا، جو ہدایت کا آفتاب ہے، جو شخص ہدایت چاہتا ہے وہ اس کو پڑھے، سمجھے اور اس کے مقتضیٰ پر عمل کرے۔(معارف القرآن، ج۱،ص۱۰۷)

نوٹ-2 قرآن کو ﴿هُدًى لِّلنَّاسِ﴾ (2/البقرہ:185) کہا گیا ہے یعنی قرآن تمام انسانوں کے لئے ہدایت ہے۔لیکن یہاں اسے هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ کہا گیا ہے۔یعنی قرآن صرف متقی لوگوں کیلئے ہدایت ہے۔اس وجہ سے کچھ لوگوں کے ذہن میں الجھن پیدا ہوتی ہے۔اس کی وضاحت یہ ہے کہ قرآن میں بالقوہ (Potentially) ہدایت موجود ہے جو ہر شخص کیلئے ہے۔لیکن اس سے بالفعل ہدایت صرف وہ لوگ حاصل کرتے ہیں جن کے دل میں اللہ کی

ناراضگی سے بچنے کا جذبہ ہوتا ہے۔ یہ بات ایسے ہی ہے جیسے پنجاب یونیورسٹی کے دروازے ہر شخص کیلئے کھلے ہوئے ہیں لیکن اس میں داخلہ کے لئے بی۔اے ہونا ضروری ہے۔ پھر داخلہ ملنے کے بعد بھی یہاں سے علم صرف وہ حاصل کرتا ہے جو فیس ادا کرے اور نظم کی پابندی کرے، ورنہ داخلہ ملنے کے بعد بھی محروم رہتا ہے۔(ازمحترم جناب لطف الرحمٰن خان صاحب)۔'' قرآن حکیم کے ایک طرف ھدی للعالمین اور ھدی للناس ہونے اور دوسری طرف ھدی للمتقین یا للمومنین ہونے پر ایک عالم کی بات بہت اچھی لگی کہ پہلی تعبیر میں استحقاق بتانا مقصود ہے جبکہ دوسری تعبیر میں افادیت بتانا مقصود ہے کہ استحقاق سب کا ہے لیکن افادیت مومنین ومتقین کے حق میں ظاہر ہوگی جیسے کسی گاؤں یا کالونی میں بجلی کے کھمبے لگ کر بجلی کی سپلائی ہو جانے پر اس سے فائدہ اٹھانے کا استحقاق سب کا ہے لیکن افادیت اسی کے حق میں ظاہر ہوگی جو میٹر لگوا کر کنکشن حاصل کرے گا۔(مفتی سعید صاحب)

نوٹ۔3 **تقویٰ:** تقویٰ کا لفظ ہماری دین کی بنیادی اصطلاحات میں سے ہے۔ اللہ کے نزدیک اس کی کتنی اہمیت ہے وہ مندرجہ ذیل آیت سے واضح ہوتی ہے ﴿ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ ﴾ (49/الحجرات:13)''لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔''

تقویٰ کی تعریف: ''تقویٰ کی تعریف متعدد تعبیرات سے کی گئی، لیکن سب سے زیادہ جامع تعریف وہ ہے جو حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سوال کرنے پر فرمائی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا تھا کہ تقویٰ کیا ہے؟ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ امیر المؤمنین! کبھی آپ کا ایسے راستہ پر بھی گزر ہوا ہوگا جو کانٹوں سے پُر ہو، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، کئی بار ہوا ہے، حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا، ایسے موقع پر آپ نے کیا کیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ دامن سمیٹ لیا اور نہایت احتیاط سے چلا، حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بس تقویٰ اسی کا نام ہے، یہ دنیا ایک خارستان ہے، گناہوں کے کانٹوں سے بھری پڑی ہے، اس لیے دنیا میں اس طرح چلنا اور زندگی گزارنا چاہیے کہ دامن گناہوں کے کانٹوں سے نہ اُلجھے، اسی کا نام تقویٰ ہے۔'' (معاف القرآن، ج۲،ص۲۴۱)۔قرآن مجید میں جو بار بار آتا ہے اِتَّقُوا اللّٰہَ تو اس کے معنی حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ یوں بیان کرتے ہیں:''بہرحال پہلے فرمایا کہ ڈرتے رہو اللہ سے لیکن یہ ڈر ایسا نہیں جیسے آدمی سانپ بچھو یا شیر بھیڑیئے سے ڈر کر دور بھاگتا ہے۔ بلکہ اس بات سے ڈرنا کہ کہیں اس کی خوشنودی اور رحمت سے دور نہ جا پڑو۔'' (تفسیر عثمانی،ص۱۵۰)

حقِ تقویٰ کیا ہے: سورۂ آل عمران، آیت 102 میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ ﴾''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔'' حقِ تقویٰ کی تفسیر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور ربیعؒ اور قتادہؒ اور حسن بصریؒ نے یہ فرمائی ہے جو مرفوعاً خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی منقول ہے: حَقَّ تُقَاتِهٖ هُوَ اَنْ يُّطَاعَ فَلَا يُعْصٰى وَ يُذْكَرَ فَلَا يُنْسٰى وَ يُشْكَرَ فَلَا يُكْفَرُ (بحرمحیط)''حق تقویٰ یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت ہر کام میں کی جائے کوئی کام اطاعت کے خلاف نہ ہو اور اس کو ہمیشہ یاد رکھیں کبھی بھولیں نہیں اور اس کا شکر ہمیشہ ادا کریں کبھی ناشکری نہ کریں۔'' (معارف القرآن، ج۲،ص:۱۲۷)

تقویٰ کے درجات: ''تقویٰ کے کئی درجات ہیں، ادنیٰ درجہ کفر وشرک سے بچنا (اور ایمان لانا ہے)۔ اس معنی کے لحاظ سے ہر مسلمان کو متقی کہا جا سکتا ہے، اگرچہ گناہوں میں مبتلا ہو، اس معنی کے لیے بھی قرآن میں کئی جگہ لفظ متقین اور تقویٰ استعمال ہوا ہے۔ دوسرا درجہ جو اصل میں مطلوب ہے وہ ہے اس چیز سے بچنا جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک پسندیدہ نہیں، تقویٰ کے فضائل وبرکات جو قرآن وحدیث میں آئے ہیں وہ اسی درجہ پر موعود ہیں۔ تیسرا درجہ تقویٰ کا اعلیٰ مقام ہے جو انبیاء علیہم السلام اور ان کے خاص نائبین اولیاء اللہ کو نصیب ہوتا ہے، کہ اپنے قلب کو ہر غیر اللہ سے بچانا اور اللہ کی یاد اور اس کی رضا جوئی سے معمور رکھنا۔ (معاف القرآن، ج۲،ص۱۲۷)

تقویٰ کے انعامات: تقویٰ کے انعامات خود قرآن مجید نے سورۃ الطلاق کی آیت نمبر 2، 3، 4، 5 میں بیان کر دیے ہیں۔ ﴿ وَ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۙ﴾''جو کوئی اللہ سے ڈرتے ہوئے کام کرے گا اللہ اس کے لیے مشکلات سے نکلنے کا کوئی راستہ پیدا کر دے گا۔'' ﴿ وَّ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ؕ وَ مَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ؕ ﴾''اور اسے ایسے راستے سے رزق دے گا جدھر اُس کا گمان بھی نہ جاتا ہو۔ جو اللہ پر بھروسا کرے اس

کے لیے وہ کافی ہے۔'' ﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا ۝۴﴾ ''جو شخص اللہ سے ڈرے اس کے معاملہ میں وہ سہولت پیدا کر دیتا ہے۔'' ﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُعْظِمْ لَهٗٓ اَجْرًا ۝۵﴾ ''جو اللہ سے ڈرے گا اللہ اُس کی برائیوں کو اُس سے دُور کر دے گا اور اس کو بڑا اجر دے گا۔'' اسی طرح الانفال کی آیت 29 میں فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ﴾ ''اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو گے تو وہ تمہیں ایک فیصلہ کی چیز دے دے گا اور تم سے دور کر دے گا تمہارے گناہ اور تمہیں بخش دے گا۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)

روزہ، تقویٰ کے حصول کا ذریعہ: اللہ تعالیٰ سورۃ البقرۃ کی آیت 183 میں فرماتے ہیں ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَي الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝۱۸۳﴾ ''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، تم پر روزے فرض کر دیے گئے جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو۔''

تقویٰ سے قریب اعمال: قرآن مجید میں دو کاموں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ تقویٰ سے قریب ہیں (۱) سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر 237 میں فرمایا ﴿وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۭ﴾ ''اور (اے اہل حق) تمہارا (اپنے حقوق کو) معاف کر دینا (بہ نسبت وصول کرنے کے) تقویٰ سے زیادہ قریب ہے (کیونکہ معاف کرنے سے ثواب ملتا ہے، اور ثواب کا کام کرنا ظاہر ہے کہ تقویٰ کی بات ہے) (ترجمہ، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ) (۲) سورۃ المائدۃ کی آیت نمبر 8 میں فرمایا ﴿اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى﴾ ''انصاف کرتے رہو (کہ) وہ تقویٰ سے بہت قریب ہے۔'' (ترجمہ، حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ)

تقویٰ کی جگہ: تقویٰ کی جگہ سینہ یعنی دل ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے اپنے سینے کی طرف تین دفعہ اشارہ کر کے فرمایا، اَلتَّقْوٰى هٰهُنَا یعنی پرہیز گاری اس جگہ ہے۔ (پوری حدیث مبارکہ کے لیے ملاحظہ ہو مظاہر حق جدید، شرح مشکوٰۃ شریف، ج ۴، ص ۴۹۳، حدیث نمبر ۱۳)

آیت 3:

﴿الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝۳﴾

ء م ن

سب سے پہلے یہ وضاحت ضروری ہے کہ ڈکشنری المنجد کے مطابق مادہ ''ء م ن'' اگر باب سَمِعَ سے آئے تو معنی ہوتے ہیں ''مطمئن ہونا'' اور اگر باب ضَرَبَ سے آئے تو معنی ہوتے ہیں ''بھروسہ کرنا، اعتبار کرنا۔'' لیکن قرآن مجید میں یہ مادہ تینوں معانی میں باب سمع سے آیا ہے، اس لئے تینوں معانی باب سمع کے تحت دیئے گئے ہیں۔ (واللہ اعلم)

(س) اَمَنَةً۔اَمْنًا۔ اَمَنًا۔اَمَانًا

(1) مطمئن ہونا۔ امن میں ہونا (لازم)۔ ﴿فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ﴾ (2/البقرہ:196) ''پس جب تم امن میں ہو تو جس نے فائدہ اُٹھایا عمرہ کا حج تک تو (اس پر واجب ہے) جو میسر ہو قربانی کے جانور میں سے۔''

(2) کسی معاملہ میں کسی پر بھروسہ کرنا (متعدی)۔ ﴿وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ﴾ (3/آل عمران:75) ''اور اہلِ کتاب میں وہ بھی ہے کہ اگر تو بھروسہ کرے اس پر ڈھیروں (چیز یا امانت) کے بارے میں تو وہ ادا کرے گا اس کو تیری طرف۔''

(3) کسی کی بات کا اعتبار کرنا۔ ﴿قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ۭ﴾ (12/یوسف:64) ''اس نے یعنی یعقوبؑ نے کہا کیا میں اعتبار کروں تم لوگوں کا اس کے بارے میں سوائے اس کے کہ جیسے میں نے اعتبار کیا تم لوگوں کا اس کے بھائی کے بارے میں اس سے پہلے۔''

(4) کسی چیز سے نڈر ہونا۔ بے خوف ہونا۔ بے فکر ہونا۔ ﴿ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَاۗءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ﴾ (67/الملک:16) ''کیا تم اِس سے نڈر ہو گئے ہو کہ جو آسمان میں ہے وہ کہیں تم کو زمین میں دھنسا نہ دے۔''

﴿ اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّ هُمْ نَآئِمُوْنَ ﴾(7/الاعراف:97)''تو کیا بستیوں والے اس سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ ہماری سختی آئے اُن پر رات کے وقت اس حال میں کہ وہ سوئے ہوں؟''

اَمَنَةً — مصدر کے علاوہ اسم بھی ہے مطلب ہے امن۔ چین۔ ﴿ ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ ﴾(3/آل عمران:154)''اس غم کے بعد پھر اللہ نے تم میں سے کچھ لوگوں پر ایسی اطمینان کی سی حالت طاری کر دی کہ وہ اونگھنے لگے۔''

مَاْمُوْنٌ — اسم المفعول ہے۔ جس سے بے خوف ہوا جائے، نڈر ہوا جائے۔ ﴿ اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ﴾(70/المعارج:28)''بے شک اُن کے رب کا عذاب ایسی چیز نہیں ہے کہ جس سے کوئی بے خوف ہو۔''

اٰمِنٌ — ج: اٰمِنُوْنَ۔ مونث: اٰمِنَةٌ۔ اسم الفاعل ہے۔ امن والا۔ پُر امن۔ ﴿ وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا ﴾(2/البقرہ:126)''اور جب کہا ابراہیمؑ نے اے میرے رب! تو بنا دے اس کو امن والا شہر۔'' یعنی پُر امن شہر۔

مَاْمَنٌ — مَفْعَلٌ کے وزن پر اسم الظرف ہے۔ امن کی جگہ۔ ﴿ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ﴾(9/التوبۃ:6)''پھر تم پہنچا دو اس کو، اس کے امن کی جگہ۔''

(ک) اَمَانَةٌ — امانت دار ہونا۔

اَمَانَةٌ — ج: اَمَانَاتٌ۔ امانت۔ ﴿ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ ﴾(33/الاحزاب:72)''بیشک ہم نے پیش کیا اس امانت کو آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر۔'' ﴿ وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ﴾(23/المؤمنون:8)''اور وہ لوگ جو اپنی امانتوں کی اور اپنے عہد کی حفاظت کرنے والے ہیں۔''

اَمِيْنٌ — فَعِيْلٌ کے وزن پر صفت ہے۔ امانتدار۔ امن والا۔ ﴿ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴾(26/الشعراء:107)''بیشک میں تم لوگوں کے لئے امانتدار رسول ہوں۔''

(افعال) اِيْمَانًا — یہ فعل لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ لازم ہو تو معنی ہوتے ہیں امن میں ہونا۔ مطمئن ہونا۔ بے خوف ہو جانا۔ ایمان لانا۔ کسی کی بات کی تصدیق کرنا (تصدیق کرنے سے اختلاف ختم ہو جاتا ہے اور امن ہو جاتا ہے) ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَادُوْا وَ النَّصٰرٰى وَ الصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ﴾(2/البقرۃ:62)''یقین جانو کہ نبی عربی ﷺ کو ماننے والے ہوں یا یہودی، عیسائی ہوں یا صابی، جو بھی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا، اُس کا اجر اس کے ربّ کے پاس ہے۔'' اگر متعدی ہو تو معنی ہوتے ہیں کسی کو امن دینا۔ جیسے فرمایا ﴿ الَّذِيْۤ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّ اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ﴾(106/قریش:4)''جس نے اُن کو بھوک میں کھانے کو دیا اور اُنہیں خوف سے امن دیا۔'' اٰمَنَ يُؤْمِنُ کے ساتھ عموماً ''لِ'' اور ''بِ'' کا صلہ بھی آتا ہے اٰمَنَ لِ کا مطلب ہے کسی بات کو تسلیم کر لینا خواہ اس میں دلی یقین شامل نہ ہو۔ جبکہ اٰمَنَ بِ کا مطلب ہے دلی یقین سے کسی کی بات کو تسلیم کرنا۔ البتہ قرآنِ مجید میں اس قاعدے کا استثناء بھی ہے۔ سورۃ العنکبوت، آیت 26 میں فرمایا: ﴿ فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ﴾ پھر لوطؑ نے اُن (حضرت ابراہیمؑ) کی تصدیق کی۔ یہاں آیت کا سیاق وسباق بتا رہا ہے کہ یہاں قلبی یقین کے ساتھ حضرت لوطؑ کا حضرت ابراہیمؑ پر ایمان لانے کا ذکر ہے (واللہ اعلم)۔

اِيْمَانٌ — اسم ذات بھی ہے۔ ایمان۔ قلبی تصدیق۔ ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْۤا اٰبَآءَكُمْ وَ اِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ﴾(9/التوبۃ:23)''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اپنے باپوں اور بھائیوں کو بھی اپنا رفیق نہ بناؤ اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیں۔'' یہ لفظ بھی ہمارے دین کی بنیادی اصطلاحات میں سے ہے۔ کسی چیز کی دل سے تصدیق کرنا ایمان ہے۔ ایمان کا محل قلب ہے۔ حقیقی ایمان اس وقت معتبر ہے جب زبان سے اقرار بھی ہو اور دل

سے تصدیق بھی۔ اگر دل میں تصدیق ہے لیکن زبان سے اقرار نہیں تو معتبر نہیں اسی طرح زبان سے تصدیق کا اظہار یا فرمانبرداری کا اقرار اس وقت معتبر نہیں جب تک دل میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تصدیق نہ ہو۔ اسی لیے ایمان مجمل کی تعریف ہے۔ ''اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ كَمَا هُوَ بِاَسْمَائِهٖ وَصِفَاتِهٖ وَ قَبِلْتُ جَمِيْعَ اَحْكَامِهٖ اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَ تَصْدِيْقٌ بِالْقَلْبِ'' میں ایمان لایا اللہ پر جیسے وہ اپنے ناموں اور صفات سے ظاہر ہے اور میں نے قبول کیے اُس کے تمام احکام زبان سے اقرار کرتے ہوئے اور دل سے تصدیق کرتے ہوئے۔'' حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ ان الفاظ میں ''ایمان'' کی شرح کرتے ہیں ''لغت میں کسی کی بات کو کسی کے اعتماد پر یقینی طور سے مان لینے کا نام ایمان ہے، اسی لیے محسوسات ومشاہدات میں کسی کے قول کی تصدیق کرنے کو ایمان نہیں کہتے، مثلاً کوئی شخص سفید کپڑے کو سفید یا سیاہ کو سیاہ کہہ رہا ہے اور دوسرا اس کی تصدیق کرتا ہے اس کو تصدیق کرنا تو کہیں گے ایمان لانا نہیں کہا جائے گا، کیونکہ اس تصدیق میں قائل کے اعتماد کو کوئی دخل نہیں بلکہ یہ تصدیق مشاہدہ کی بنا پر ہے اور اصطلاح شرع میں خبر رسول ﷺ کو بغیر مشاہدہ کے محض رسول ﷺ کے اعتماد پر یقینی طور سے مان لینے کا نام ایمان ہے۔'' پھر آگے فرماتے ہیں: ''اس تعریف میں ماننے کا نام ایمان بتلایا گیا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ محض جاننے کو ایمان نہیں کہتے، کیونکہ جہاں تک جاننے کا تعلق ہے وہ تو ابلیس وشیطان اور بہت سے کفار کو بھی حاصل ہے کہ ان کو آنحضرت ﷺ کے صدق کا یقین تھا، مگر اس کو مانا نہیں اس لیے وہ مومن نہیں۔'' (معارف القرآن، ج ا، ص: ۱۰۹)۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ تفسیر عثمانی میں فرماتے ہیں: ''ایمان شرعی دو چیزوں کا نام ہے صحیح معرفت اور تسلیم وانقیاد (بات ماننا، تابعدار ہونا) یعنی خدا اور رسول ﷺ کے جملہ ارشادات کو صحیح صادق سمجھ کر تسلیم وقبول کے لیے اخلاص سے گردن جھکا دینا۔ اس تسلیمی جزء کے لحاظ سے ایمان فی الحقیقت تمام قوانین واحکام الٰہیہ کے ماننے اور جملہ حقوق ادا کرنے کا ایک مضبوط عہد واقرار ہے۔'' (تفسیر عثمانیؒ، ص ۱۳۹)۔

ایمان اور اطمینان میں فرق: ایمان اور اطمینان کا فرق واضح کرتے ہوئے حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر 260 (اس آیت مبارکہ میں حضرت ابراہیمؑ اللہ تعالیٰ سے درخواست کرتے ہیں کہ اے اللہ آپ مُردوں کو کس طرح زندہ کریں گے۔ جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کیا آپؑ کو اس پر ایمان نہیں تو حضرت ابراہیمؑ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ ایمان تو ہے لیکن یہ درخواست اس لیے کر رہا ہوں کہ میرے دل کو اطمینان حاصل ہو جائے) کے تحت لکھتے ہیں: ''انسان کی فطرت ہے کہ جو چیز اس کے مشاہدہ میں نہ ہو اس کی کیفیات کی کھوج لگانے کی فکر میں رہا کرتا ہے، اس میں اس کا خیال مختلف راہوں پر چلتا ہے، جس میں ذہنی انتشار کی تکلیف بھی برداشت کرتا ہے، اس ذہنی انتشار کو رفع کر کے قلب کو سکون مل جانے ہی کا نام اطمینان ہے، اسی کے لیے حضرت خلیل اللہؑ نے یہ درخواست پیش فرمائی تھی۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ایمان اور اطمینان میں کیا فرق ہے، ایمان اس اختیاری یقین کا نام ہے جو انسان کو رسول ﷺ کے اعتماد پر کسی غیب کی بات کے متعلق حاصل ہو جائے اور اطمینان سکونِ قلب کا نام ہے۔ بعض اوقات نظروں سے غائب کسی چیز پر یقین کامل تو ہوتا ہے، مگر قلب کو سکون اس لیے نہیں ہوتا کہ اس کی کیفیات کا علم نہیں ہوتا، یہ سکون صرف مشاہدہ سے حاصل ہو سکتا ہے، حضرت خلیل اللہؑ کو بھی حیات بعد الموت پر تو کامل ایمان ویقین تھا، سوال صرف کیفیت احیاء کے متعلق تھا۔''

ایمان اور یقین میں فرق: حضرت مولانا امین احسن اصلاحیؒ ایمان اور یقین میں فرق واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''ایمان اور ایقان کے درمیان تھوڑا سا فرق ہے جس کو سمجھ لینا چاہیے۔ ایمان کے معنی تصدیق کرنے اور مان لینے کے ہیں۔ اس کا ضد کفر وانکار اور تکذیب ہے۔ ایقان کے معنی یقین کرنے کے ہیں۔ اس کا ضد گمان اور شک ہے جس طرح کسی شے پر یقین رکھنے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی اس پر ایمان بھی رکھتا ہو (حضرت موسیٰ علیہ السلام

نے جو نشانیاں دکھائیں فرعون کو پورا یقین تھا کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں لیکن اس یقین کے باوجود وہ ان پر ایمان نہیں لایا) اسی طرح کسی چیز پر ایمان رکھنے کے لیے اس پر یقین کرنا شرط نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ آدمی کا ایمان محض گمان غالب پر مبنی ہو اور وہ آہستہ آہستہ گمان کی منزل سے نکل کر یقین کی منزل تک پہنچے اور اس طرح اس کے ایمان کی تکمیل ہو جائے۔'' (تدبر قرآن، ج ۱، ص ۹۳)

اٰمِنْ ج: اٰمِنُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو ایمان لا۔ ﴿وَيْلَكَ اٰمِنْ ۖ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚ﴾ (46/الاحقاف:17) ''تیرے لئے تباہی ہے۔ تو ایمان لا۔ یقیناً اللہ کا وعدہ حق ہے۔'' ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ﴾ (2/البقرۃ:13) ''اور جب کہا جاتا ہے ان سے کہ تم لوگ ایمان لاؤ جیسے لوگ (صحابہؓ) ایمان لائے۔''

مُؤْمِنٌ ج: مُؤْمِنُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ یہ لفظ جب انسان کے لیے بولا جائے تو اس کے دو معنی لیے جاتے ہیں (۱) اصطلاحی معنی یعنی ایمان لانے والا۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے کلام کی تصدیق کرنے والا مثلاً ﴿هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ۭ﴾ (64/التغابن:2) ''وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا، پھر تم میں سے کوئی کافر ہے اور کوئی مومن۔'' (۲) عام معنی یعنی یقین کرنے والا۔ مثلاً ﴿وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ ۝﴾ (12/یوسف:17) ''اور آپ ہماری بات کا یقین نہ کریں گے چاہے ہم سچے ہی ہوں۔''

یہ لفظ جب اللہ تعالیٰ کے لیے بولا جائے تو اس کا مطلب ہوتا ہے امن دینے والا اور یہ لفظ اسمائے حسنیٰ میں سے ہے مثلاً ﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ﴾ (59/الحشر:23) ''کوئی الٰہ نہیں سوائے اس کے جو بادشاہ ہے، پاک ہے، سلامتی ہے، امن دینے والا ہے۔''

مُؤْمِنَةٌ ج: مُؤْمِنَاتٌ۔ ایمان لانے والی۔ ﴿وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ﴾ (2/البقرۃ:221) ''بے شک مسلمان لونڈی بہتر ہے (آزاد) مشرک عورت سے اگرچہ وہ پسند آئے تمہیں۔'' ﴿وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۗءُ بَعْضٍ ۘ﴾ (9/التوبۃ:71) ''اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔''

(افتعال) اِئْتِمَانًا کسی کو امانت دار بنانا۔ کسی کو امین بنانا۔ کسی کا اعتبار کرنا۔

اُؤْتُمِنَ ماضی مجہول واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ وہ جس کو امین بنایا گیا۔ جس پر اعتبار کیا گیا۔ ﴿فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ﴾ (2/البقرۃ:283) ''پس چاہیے کہ ادا کرے وہ جس پر اعتبار کیا گیا اُس کی امانت کو۔''

غ ی ب

(ض) غَيْبًا پوشیدہ ہونا۔ غیر حاضر ہونا۔ کسی چیز کا انسان کے علم و احساس سے بالاتر ہونا۔

غَيْبٌ ج غُيُوْبٌ۔ اسم ذات ہے۔ حواس سے پوشیدہ چیز یا بات۔ لفظ غیب پورے قرآنِ مجید میں بصورت نکرہ کہیں نہیں آیا، مضموم بھی آیا ہے، مفتوح بھی اور مکسور بھی مگر ہر جگہ معرفہ ہے۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں: ''قرآن میں لفظ غیب سے وہ تمام چیزیں مراد ہیں جن کی خبر رسول اللہ ﷺ نے دی ہے اور ان کا علم بداہت عقل (یعنی عقل کی فوری رسائی) اور حواسِ خمسہ کے ذریعہ نہیں ہوسکتا، اس میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات بھی آجاتی ہیں، تقدیری امور، جنت و دوزخ کے حالات، قیامت اور اس میں پیش آنے والے واقعات بھی، فرشتے، تمام آسمانی کتابیں اور تمام انبیاء سابقین بھی۔'' (معارف القرآن، ج ۱، ص ۱۰۹)۔ ﴿اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝﴾ (5/المآئدہ:116) ''بیشک تو ہی تمام غیبوں کا خوب جاننے والا ہے۔''

غَائِبٌ ج: غَائِبُوْنَ۔ مونث: غَائِبَةٌ۔ اسم الفاعل ہے۔ غائب ہونے والا یعنی غائب۔ ﴿وَمَا مِنْ غَاۗىِٕبَةٍ فِي السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝﴾ (27/النمل:75) ''اور نہیں ہے کوئی بھی غائب ہونے والی چیز آسمانوں میں اور زمین میں مگر وہ ایک واضح کتاب میں ہے۔''

غَيَابَةٌ اسم ذات ہے۔پستی۔گہرائی۔تاریکی۔نشیبی زمین۔''ہر وہ چیز جو کسی چیز کو چھپالے اور غائب کر دے۔اس لیے قبر کو بھی غَيَابَةٌ کہا جاتا ہے۔'' (معارف)﴿ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا يُوْسُفَ وَ اَلْقُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ﴾ (12/یوسف:10)''کہا ان میں سے ایک کہنے والے نے قتل مت کرو یوسفؑ کو اور اس کو ڈال دو کنویں کی گہرائی میں۔''

(افتعال) اِغْتِيَابًا پیٹھ پیچھے کسی کا عیب بیان کرنا اس طرح کہ اگر وہ اُسے سنتا تو اُسے برا لگتا۔غیبت کرنا۔چغلی کرنا۔صاحبؒ تفہیم القرآن فرماتے ہیں:''غیبت کی تعریف یہ ہے کہ'' آدمی کسی شخص کے پیٹھ پیچھے اس کے متعلق ایسی بات کہے جو اگر اسے معلوم ہو تو اس کو ناگوار گزرے۔'' یہ تعریف خود رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے۔حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے جسے مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور دوسرے محدثین نے نقل کیا ہے، اس میں حضور ﷺ نے غیبت کی یہ تعریف بیان فرمائی ہے: ذِكْرُكَ اَخَاكَ بِمَا يَكْرَهُ۔ قِيْلَ اَفَرَاَيْتَ اِنْ كَانَ فِيْ اَخِيْ مَا اَقُوْلُ؟ قَالَ اِنْ كَانَ فِيْهِ مَا تَقُوْلُ فَقَدِ اغْتَبْتَهٗ وَ اِنْ لَّمْ يَكُنْ فِيْهِ مَا تَقُوْلُ فَقَدْ بَهَتَّهٗ۔ غیبت یہ ہے کہ''تو اپنے بھائی کا ذکر اس طرح کرے جو اسے ناگوار ہو۔'' عرض کیا گیا کہ اگر میرے بھائی میں وہ بات پائی جاتی ہو جو میں کہہ رہا ہوں تو اس صورت میں آپ کا کیا خیال ہے؟ فرمایا اگر اس میں وہ بات پائی جاتی ہو تو تو نے اس کی غیبت کی، اور اگر اس میں وہ موجود نہ ہو تو تو نے اس پر بہتان لگایا۔'' ایک دوسری روایت جو امام مالک نے مؤطا میں حضرت مُطّلِب بن عبداللہ سے نقل کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں: اِنَّ رَجُلًا سَئَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ مَا الْغِيْبَةُ؟ فَقَالَ اَنْ تَذْكُرَ مِنَ الْمَرْءِ مَا يَكْرَهُ اَنْ يَّسْمَعَ۔ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَ اِنْ كَانَ حَقًّا؟ قَالَ اِذَا قُلْتَ بَاطِلًا فَذٰلِكَ الْبُهْتَانُ۔ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا غیبت کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا''یہ کہ تو کسی شخص کا ذکر اس طرح کرے کہ وہ سنے تو اسے ناگوار ہو۔'' اس نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اگر چہ میری بات حق ہو؟ آپ ﷺ نے جواب دیا اگر تیری بات باطل ہو تو یہی چیز پھر بہتان ہے۔'' ان ارشادات سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کے خلاف اس کے پیچھے جھوٹا الزام لگانا بہتان ہے اور اس کے واقعی عیوب بیان کرنا غیبت۔(تفہیم القرآن، ج۵،ص۹۰)

لَا يَغْتَبْ فعل نہی ہے۔﴿ وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ؕ ﴾(49/الحجرات:12)''تم میں سے کوئی غیبت نہ کرے کسی کی۔''

يُقِيْمُوْنَ (ق و م): الفاتحہ آیت 5 دیکھیں۔

ص ل و

(ن) صَلْوًا پیٹھ کے درمیان میں مارنا۔نرم ہونا (ثلاثی مجرد سے قرآن مجید میں استعمال نہیں ہوا)۔

(تفعیل) صَلَاةً (اس کا مصدر خلافِ قاعدہ صَلَاةً استعمال ہوتا ہے) دعا کرنا۔دعا دینا۔تحسین و تعظیم کرنا۔نشوونما دینا۔بڑھانا۔نماز پڑھنا (نماز کی اصل دعا ہی ہے)۔چنانچہ محاورہ ہے صَلَّيْتُ عَلَيْهِ میں نے اسے دعا دی، نشوونما دی اور بڑھایا۔اسی طرح حدیث میں آتا ہے اِذَا دُعِيَ اَحَدُكُمْ اِلٰى طَعَامٍ فَلْيُجِبْ وَاِنْ كَانَ صَائِمًا فَلْيُصَلِّ کہ''جب کسی کو کھانے پر بلایا جائے تو اسے چاہیے کہ قبول کرلے اور اگر روزہ دار ہے تو وہ ان کے لیے دعا کر کے واپس چلا آئے۔'' اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کے لیے دعا (صلاۃٌ) کرنے کے معنی ہوتے ہیں ان کو نشوونما دینا، بڑھانا، ان پر اپنی رحمت کا نزول کرنا۔جب دعا (صلاۃٌ) کی نسبت بندوں کی طرف ہو، خواہ فرشتے ہوں یا انسان تو اس کے معنی نزول رحمت کی دعا اور استغفار یعنی دعائے مغفرت کے ہوتے ہیں۔یعنی فرشتے اور انسان اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ جن کے حق میں ہم دعا کر رہے ہیں تو ان پر اپنا فضل فرما اور انہیں اپنی عنایات سے نواز۔﴿ اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ؕ ﴾(33/الاحزاب:56)''اللہ اور اس کے ملائکہ نبی ﷺ پر درود بھیجتے ہیں۔'' یعنی اللہ رحمت نازل فرماتا ہے اور فرشتے نزولِ رحمت کی دعا کرتے ہیں۔

صَلَاۃٌ اسم ذات بھی ہے۔اس لفظ کا قرآنی املا صَلٰوۃٌ ہے اور اس کی جمع صَلَوٰتٌ ہے۔نماز، شفقت ورحمت، عبادت گاہ، دعا۔ اصطلاح شرع میں وہ خاص عبادت صَلٰوۃٌ کہلاتی ہے جس کو نماز کہا جاتا ہے۔اس کی اصل بھی دعا ہی ہے، اسی لیے اسے صَلٰوۃٌ کہا جاتا ہے۔اور عربی زبان کا یہ اسلوب ہے کہ کسی چیز کے جزء ہی کو اس چیز کا نام دے دیا جاتا ہے۔اسے تَسْمِیَۃُ الشَّیْءِ بِاِسْمِ الْجُزْءِ کہتے ہیں۔ ﴿ حٰفِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰی ﴾ (2/البقرۃ:238) ''پابندی کرو سب نمازوں کی اور خصوصاً درمیانی نماز کی۔'' ﴿ اُولٰٓئِکَ عَلَیْھِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَ رَحْمَۃٌ ﴾ (2/البقرۃ:157) ''یہی وہ خوش نصیب ہیں جن پر اُن کے رب کی طرح طرح کی نوازشیں اور رحمت ہے۔''

قرآن مجید میں جہاں بھی لفظ صَلٰوۃ کی اضافت ضمیر بنی آدم کی طرف ہے وہاں یہ الف کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔جو لام سے ملا ہوا ہے۔مثلاً صَلَاتُکَ، صَلَاتِیْ، صَلَاتُھُمْ وغیرہ۔البتہ دو جگہ ضمیر مخاطب کی طرف اضافت کے باوجود واؤ ہی کے ساتھ لکھا ہوا ہے جو لام سے ملا ہوا ہے۔(ا) ﴿ اِنَّ صَلٰوتَکَ سَکَنٌ لَّھُمْ ﴾ (9/التوبۃ:103) (ب) ﴿ قَالُوْا یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُکَ تَاْمُرُکَ ﴾ (11/ھود:87)۔اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دو قرا ءتیں ہیں اس لیے یہاں اس لفظ کو یوں لکھا جاتا ہے۔(واللہ اعلم)۔کبھی عبادت گاہ کو بھی صَلَاۃٌ کہہ دیا جاتا ہے۔چنانچہ قرآن میں کَنَائِس یعنی یہود کی عبادت گاہوں کو صَلَوٰتٌ کہا گیا ہے۔مثلاً ﴿ لَّھُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِیَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ ﴾ (22/الحج:40) ''تو راہبوں کے صومعے، عیسائیوں کے گرجے اور یہود کے عبادت خانے اور مسلمانوں کی مسجدیں ویران ہو چکی ہوتیں۔'' قرآن مجید میں صَلَاۃٌ کی نسبت تمام جہان کی طرف بھی کی گئی ہے۔مثلاً ﴿ کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَہٗ وَ تَسْبِیْحَہٗ ﴾ (24/النور:41) ''ہر ایک کو معلوم ہے اپنی اپنی دعا اور اپنی تسبیح۔'' حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اس آیت کے تحت لکھتے ہیں: ''یاد رہے کہ لفظ صلٰوۃ کچھ اصطلاحی نماز کے ساتھ مخصوص نہیں، قرآن نے ملائکہ اور بشر سے گزر کر تمام جہان کی طرف صلٰوۃ کی نسبت کی ہے (النور۔41) اور یہ بھی بتلا دیا کہ ہر چیز کی تسبیح وصلوۃ کا حال اللہ ہی جانتا ہے کہ کس کی صلٰوۃ وتسبیح کس رنگ کی ہے۔'' (تفسیر عثمانی، ص ۴۱۰)۔حضرت مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ صلٰوۃ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''صلوۃ کے لفظی معنی دعا کے ہیں۔اصطلاح شریعت میں ایک مخصوص ہیئت کی معروف عبادت کا نام ہے۔اور یہ نام بھی اسی سے پڑا کہ دعا ہی اس عبادت کا جزو اعظم ہے۔محققین نے کہا ہے کہ نماز تو یکسر دعا ہے۔دعا زبان سے بھی، دل سے بھی، اعضائے ظاہری سے بھی۔یعنی دعا قولی، دعا قلبی، دعا فعلی کا مجموعہ۔(تفسیر ماجدی، ص ۷)

صَلِّ ج: صَلُّوْا۔فعل امر ہے۔تو دعا کر۔نماز پڑھ۔﴿ فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ ﴾ (108/الکوثر:2) ''پس آپ ﷺ نماز پڑھیں اپنے رب کے لئے اور قربانی دیں۔'' ﴿ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ ﴾ (33/الاحزاب:56) ''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تم لوگ دعا کرو ان کے لئے یعنی درود بھیجو۔''

مُصَلٍّ ج: مُصَلُّوْنَ، مُصَلِّیْنَ۔اسم الفاعل کا صیغہ ہے۔نماز پڑھنے والا۔﴿ قَالُوْا لَمْ نَکُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ ﴾ (74/المدثر:43) ''ان لوگوں نے کہا ہم نہیں تھے نماز ادا کرنے والوں میں سے۔''

مُصَلًّی اسم المفعول ہے جو بطور اسم الظرف استعمال ہوتا ہے۔نماز کی جگہ۔﴿ وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰھٖمَ مُصَلًّی ﴾ (2/البقرہ:125) ''اور تم لوگ بنا لو ابراہیمؑ کے کھڑے ہونے کی جگہ میں سے نماز ادا کرنے کی جگہ۔''

مِمَّا مرکب ہے۔اصل میں 'مِنْ' اور 'مَا' تھا۔مِنْ حرف جر اور مَا اسم موصولہ یا زائدہ یا مصدریہ یا استفہامیہ ہوسکتا ہے۔اگر مَا استفہامیہ ہو تو اس کے الف کو اکثر حذف کر دیا جاتا ہے اور یوں لکھا جاتا ہے مِمَّ۔یاد کرلیں کہ 'مَا' بھی کئی قسم کا ہے۔مَا پہلے دو قسموں میں تقسیم ہوتا ہے (۱) حرفیہ (۲) اسمیہ۔پھر حرفیہ کی چار قسمیں ہیں: نافیہ عاملہ، نافیہ غیر عاملہ، مصدریہ، زائدہ۔اور ما اسمیہ کی تین قسمیں ہیں: استفہامیہ، موصولہ، ظرفیہ۔مزید تفصیل کے لیے عربی کا معلم، ج ۴، ص ۵۹ دیکھیں۔

ر ز ق

(ن) رِزْقًا معاوضہ کے بغیر کوئی چیز دینا پھر دیتے رہنا۔عطیہ جاریہ دینا۔ روزی دینا۔عطا کرنا۔﴿ اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یُحْیِیْكُمْ ؕ ﴾(30/الروم:40)''اللہ وہ ہی ہے جس نے تم لوگوں کو پیدا کیا پھر اس نے تم لوگوں کو روزی دی، پھر وہ تم لوگوں کو موت دے گا پھر وہ تم لوگوں کو زندہ کرے گا۔''

رِزْقٌ ج:اَرْزَاقٌ۔اسم ذات ہے۔وہ چیز جو عطیہ جاریہ کے طور پر دی جائے۔جو چیز ایک مرتبہ دی جائے اسے رِزْقَةٌ کہتے ہیں۔ پیر کرم شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: ''اَلرِّزْقُ فِی اللُّغَةِ النَّصِیْبُ وَالْعَطَاءُ وَ یُطْلَقُ عَلَی الْحِسِّیِ وَالْمَعْنَوِیِّ۔یعنی لغت میں رزق کہتے ہیں حصہ اور بخشش کو خواہ حسی ہو یا معنوی۔مال، اولاد، علم ومعرفت اسی لحاظ سے سب رزق ہیں۔'' (ضیاء القرآن، ج۱،ص۳۱)۔صاحبؒ تفہیم القرآن فرماتے ہیں:''رزق عربی زبان میں محض خوارک تک محدود نہیں بلکہ عطا، نصیب اور بخشش کے معنی میں عام ہے۔اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی انسان کو دیا ہے حتی اولاد تک، اس کا رزق ہے۔مشہور دعا ہے۔اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ یہاں رزق سے مراد توفیق ہے۔'' (واللہ اعلم) (تفہیم القرآن)۔صاحبؒ تفسیر ماجدی لکھتے ہیں:''رزق کا لفظ کلام عرب میں بڑے وسیع معنی رکھتا ہے۔اس کے اندر ہر قسم کی نعمتیں آ جاتی ہیں خواہ ظاہری و مادی ہوں، مثلاً مال، صحت و اولاد، یا معنوی و روحانی ہوں، مثلاً علم وحکمت، فہم سلیم وغیرہ۔'' (تفسیر ماجدیؒ،ص۸)۔عربی محاورے میں بولا جاتا ہے رُزِقْتُ عِلْمًا مجھے علم دیا گیا۔امام راغبؒ نے اس لفظ کی بہت عمدہ وضاحت کی ہے۔اب اس کا خلاصہ پیش خدمت ہے۔فرماتے ہیں:اَلرِّزْقُ۔وہ عطیہ جو جاری ہو۔پھر یہ مندرجہ ذیل معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

(۱) دنیوی عطاء: اس کے اندر سب نعمتیں آ جاتی ہیں خواہ ظاہری ہوں جیسے مال و دولت، صحت، اولاد وغیرہ، خواہ روحانی ہوں جیسے، علم وحکمت، فہم اور تدبر وغیرہ۔مثلاً﴿ وَ اَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ ﴾(63/المنافقون:10)''جو رزق ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرو۔''اور﴿ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ۝ ﴾(2/البقرۃ:3)''اور جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔'' اِن دونوں آیات میں رزق اسی وسیع اور عام معنوں میں استعمال ہوا ہے۔﴿ قَالَ یٰقَوْمِ اَرَءَیْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَ رَزَقَنِیْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ ﴾(11/ھود:88)''آپؑ نے کہا اے میری قوم! بھلا یہ تو بتاؤ اگر میں روشن دلیل پر ہوں اپنے رب کی طرف سے اور اس نے عطا بھی کی ہو مجھے اپنی جناب سے عمدہ روزی۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔یہاں رزقًا حسنًا سے مراد علم وحی ہے۔

(۲) اخروی عطاء: مثلاً﴿ بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ ۝۱۶۹ ﴾(3/آل عمران:169)''وہ تو حقیقت میں زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس رزق پا رہے ہیں۔'' اور﴿ وَ لَهُمْ رِزْقُهُمْ فِیْهَا بُكْرَةً وَّ عَشِیًّا ۝۶۲ ﴾(19/مریم:62)''اور انہیں اُس میں اُن کا رزق صبح وشام ملتا رہے گا۔'' ان دونوں آیات میں رزق سے انعامات اخروی مراد ہیں۔

(۳) حصہ: مثلاً﴿ وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ۝۸۲ ﴾(56/الواقعۃ:82)''اور اس نعمت میں اپنا حصہ تم نے یہ رکھا ہے کہ اسے جھٹلاتے ہو؟'' اس آیت میں رزق سے مراد حصہ ہے اور مطلب یہ کہ نعمتِ الٰہی کی تکذیب کو تم نے اپنا حصہ بنالیا ہے۔

(۴) طعام (کھانا): مثلاً:﴿ فَلْیَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ ﴾(18/الکہف:19)''چاہیے کہ وہ وہاں سے تمہارے لیے کچھ کھانے کے لیے لائے۔'' آیت میں رزق سے مراد کھانا ہے جو انسانی غذا بنتا ہے۔

(۵) بارش: مثلاً:﴿ وَفِی السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ ۝۲۲ ﴾(51/الذاریات:22)''آسمان ہی میں ہے تمہارا رزق بھی اور وہ چیز بھی جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔'' اس آیت میں عام طور پر مفسرین نے رزق سے مراد بارش لی ہے اس لیے کہ

وہ زمین سے حاصل ہونے والے رزق وغذائیات کا سبب ہے۔(واللہ اعلم)۔

اُرْزُقْ — فعل امر ہے۔تو عطا کر۔ ﴿وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ﴾ (14/ابراہیم:37) ''اور تو انہیں عطا کر پھلوں میں سے شائد کہ وہ لوگ شکر ادا کریں۔''

رَازِقٌ — ج: رَازِقُوْنَ- اسم الفاعل ہے۔عطا کرنے والا۔ یہ لفظ اللہ تعالیٰ اور انسانوں دونوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ ﴿وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ﴾ (22/الحج:58) ''اور یقیناً اللہ ہی سب سے بہتر عطا کرنے والا ہے۔''

﴿وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ وَ مَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ﴾ (15/الحجر:20) ''اور اس میں معیشت کے اسباب فراہم کیے، تمہارے لیے بھی اور اُن بہت سی مخلوقات کے لیے بھی جن کے رازق تم نہیں ہو۔''

رَزَّاقٌ — فَعَّالٌ کے وزن پر اسم مبالغہ ہے۔ یہ لفظ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ﴾ (51/الذّٰرِيٰت:58) ''یقیناً اللہ ہی بہت زیادہ عطا کرنے والا ہے۔''

ن ف ق

(ن-س) نَفْقًا، نُفُوْقًا، نَفَاقًا — (۱) خرچ ہوجانا۔ختم ہوجانا۔کچھ باقی نہ رہنا۔(۲) چیزوں کا خوب لین دین ہونا۔مال بکنا، بازار کا پر رونق ہوجانا، اس معنی کے لحاظ سے یہ لفظ کَسَاد کی ضد ہے جیسے اردو میں کساد بازاری کہہ دیتے ہیں یعنی مندا۔ نَفَقَ الشَّیْءُ کا مطلب ہے وہ چیز چلی گئی، ختم ہوگئی۔ نَفَقَتِ الدَّرَاهِمُ کا مطلب ہے روپیہ ختم ہوگیا۔ نَفَقَتِ الدَّابَّةُ کا مطلب ہے گھوڑا مرگیا۔(قرآن مجید میں ثلاثی مجرد سے فعل استعمال نہیں ہوا)

نَفَقَةٌ — ج: نَفَقَاتٌ۔اسم ذات ہے۔خرچہ۔خرچ ہونے والی چیز۔ ﴿ وَ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ﴾ (2/البقرہ:270) ''اور جو تم لوگ خرچ کرو کسی خرچہ میں سے یا منت مانگو کسی منت میں سے تو یقیناً اللہ اس کو جانتا ہے۔''

نَفَقٌ — سرنگ۔سرنگ کے بھی دو منہ ہوتے ہیں۔ ﴿فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ﴾ (6/الانعام:35) ''تو اگر آپ ﷺ میں استطاعت ہے کہ آپ ﷺ تلاش کرلیں کوئی سرنگ زمین میں۔''

(افعال) اِنْفَاقًا — خرچ کرنا۔ ﴿لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قٰتَلَ﴾ (57/الحدید:10) برابر نہیں ہے تم میں سے وہ جس نے خرچ کیا الفتح سے پہلے (یعنی فتح مکہ سے پہلے) اور قتال کیا۔''

اَنْفِقْ — ج: اَنْفِقُوْا۔فعل امر ہے۔تو خرچ کر۔ ﴿ وَ اَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ ﴾ (63/المنافقون:10) اور تم لوگ خرچ کرو اس میں سے جو ہم نے تم کو عطا کیا اس سے پہلے کہ آئے تم میں سے کسی ایک کو موت۔''

مُنْفِقٌ — ج: مُنْفِقُوْنَ-اسم الفاعل ہے۔خرچ کرنیوالا۔ ﴿ وَ الْمُنْفِقِيْنَ وَ الْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ﴾ (3/آل عمران:17) ''اور خرچ کرنے والے اور مغفرت مانگنے والے راتوں کے پچھلے پہر میں۔''

(مفاعلہ) مُنَافَقَةً و نِفَاقًا — دورُخا ہونا۔دوغلا ہونا۔ ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ (59/الحشر:11) ''کیا آپ ﷺ نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جو دورُخے ہوئے ، وہ لوگ کہتے ہیں اپنے بھائیوں سے جنہوں نے کفر کیا۔'' نَافِقَاءُ اور نُفَقَةٌ، گوہ (زمین پر رینگ کر چلنے والا ایک بڑے سائز کا جانور) کے بھٹ (کھوہ، بل) کو کہتے ہیں جس کے کم از کم دو منہ ہوتے ہیں ایک دہانے سے گوہ داخل ہوتی ہے اور شکاری اس سوراخ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو دوسرے سوراخ سے باہر نکل جاتی ہے۔نفاق اور منافقت اصطلاح قرآنی میں اسی دورُخی کا نام ہے، بظاہر زبان سے آدمی

مؤمن ہونے کا اقرار کرتا ہے اور دکھاوے کی نمازیں بھی پڑھتا ہے لیکن دل میں کافر رہتا ہے اسلام کے خلاف عقیدہ رکھتا ہے ایسے آدمی کو عرفِ شریعت میں منافق کہا جاتا ہے لیکن اگر عقیدہ مومنانہ ہو اور عمل کافرانہ تو دورُخی کی یہ بھی ایک شکل ہوتی ہے ایک دروازہ (عقیدہ) سے آدمی اسلام کے دائرہ میں داخل ہوتا ہے اور دوسرے (عمل کے) راستہ سے خارج ہوتا ہوا نظر آتا ہے لیکن قرآنی اصطلاح میں ایسے آدمی کو منافق نہیں کہا جاتا بلکہ فاسق اور عاصی کہا جاتا ہے۔ (البتہ حدیث پاک میں ایسے شخص کو بھی منافق کا نام دیا گیا ہے یعنی ''عملی منافق'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''منافق کی تین علامتیں ہیں اس کے بعد مسلمؒ نے اپنی روایت میں اتنا اضافہ کیا ''اگرچہ وہ نماز پڑھے اور روزہ رکھے اور مسلمان ہونے کا دعویٰ بھی کرے۔ اس کے بعد بخاریؒ و مسلمؒ دونوں متفق ہیں (وہ تین علامتیں یہ ہیں) جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو اس کے خلاف کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔'' (متفق علیہ، بحوالہ مظاہر حق جدید، ج ۱، ص: ۱۳۴، از مفتی سعید صاحب)

مُنَافِقٌ ج: مُنَافِقُوْنَ۔ مونث: مُنَافِقَةٌ۔ ج: مُنَافِقَاتٌ۔ اسم الفاعل ہے۔ دورُخا ہونے والا یعنی منافق۔ ﴿ يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ﴾ (9/التوبۃ:64) ''ڈرتے ہیں منافق کہ نازل کردی جائے ان کے بارے میں کوئی سورت جو جتلا دے ان کو وہ، جو ان کے دلوں میں ہے۔'' ﴿ اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ﴾ (9/التوبۃ:67) ''منافق مرد اور منافق عورتیں، ان کے بعض، بعض سے ہیں یعنی سب ایک جیسے ہیں۔''

ترکیب اَلَّذِيْنَ اسم موصول ہے۔ يُؤْمِنُوْنَ فعل مضارع ہے اور اس میں شامل ضمیر اس کا فاعل، آگے بِالْغَيْبِ جار مجرور متعلق ہیں يُؤْمِنُوْنَ سے۔ جملہ فعلیہ يُؤْمِنُوْنَ اپنے متعلق سے مل کر صلہ ہے اَلَّذِيْنَ کا اور صلہ اور موصولہ مل کر صفت ہیں اَلْمُتَّقِيْنَ کی اسی لیے محلاً حالت جر میں ہیں۔ 'وَ' عطف کا ہے اور آگے جملہ فعلیہ يُقِيْمُوْنَ عطف ہے يُؤْمِنُوْنَ پر اور الصَّلٰوةَ مفعول بِہٖ ہے۔ یہ جملہ بھی صفت ہے اَلْمُتَّقِيْنَ کی۔ 'وَ' عطف کا ہے اور مِمَّا، مِنْ حرف جارہ اور 'ما' موصول کا مرکب ہے۔ رَزَقْنَا فعل + فاعل اور هم ضمیر اس کا مفعول، پورا جملہ فعلیہ صلہ ہے 'ما' موصول کا اور جار مجرور متعلق ہیں آگے جملہ فعلیہ يُنْفِقُوْنَ سے۔ يُنْفِقُوْنَ بھی عطف ہے يُقِيْمُوْنَ پر اور یہ جملہ بھی صفت ہے اَلْمُتَّقِيْنَ کی۔ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ کو اصل فعل يُنْفِقُوْنَ سے پہلے لا کر اس حقیقت میں تاکید اور زور پیدا کیا گیا ہے کہ انسان کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے۔

ترجمہ				
البقرۃ:3	اَلَّذِيْنَ	يُؤْمِنُوْنَ	بِالْغَيْبِ	وَيُقِيْمُوْنَ	الصَّلٰوةَ
	وہ لوگ جو	ایمان لاتے ہیں	غیب پر	اور جو لوگ قائم رکھتے ہیں	نماز کو

وَمِمَّا	رَزَقْنٰهُمْ	يُنْفِقُوْنَ ۙ﴿۳﴾
اور اس میں سے جو	ہم نے عطا کیا ان کو	وہ لوگ خرچ کرتے ہیں

نوٹ۔1 قرآن مجید میں صلٰوۃ کے ساتھ اکثر و بیشتر اقامت کا لفظ آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم کردہ نماز کو اس کے ظاہری نظام اور باطنی روح کے ساتھ ادا کرنے کی تاکید ہے۔ جبکہ آیت فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى (نہ اس نے تصدیق کی اور نہ اس نے نماز پڑھی) (القیامۃ:31) میں وَلَا صَلّٰى سے مراد ہے کہ اس نے رسمی نماز بھی نہیں پڑھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسمی نماز پڑھنا بھی فائدہ سے خالی نہیں ہے۔ ایک روایت میں ہے اِنَّ الْمُصَلِّيْنَ كَثِيْرٌ وَالْمُقِيْمِيْنَ لَهَا قَلِيْلٌ (نماز پڑھنے والے بہت ہیں جبکہ اس کو قائم کرنے والے کم ہیں)۔

نوٹ۔2 قرآن مجید میں انفاق سے مراد انفاق فی سبیل اللہ ہی ہوتا ہے خواہ فی سبیل اللہ کے الفاظ ساتھ نہ بھی لکھے ہوں۔ جس طرح صرف ایمان کا ذکر ہو تب بھی اس سے مراد وہ ایمان ہوتا ہے جو قرآن وسنت کے مطابق ہو۔ مولانا مودودیؒ سورۃ الحج کی آیت 35 کے تحت ''انفاق'' کی وضاحت

کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''اللہ نے کبھی حرام و ناپاک مال کو اپنا رزق نہیں فرمایا ہے۔ اس لیے آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو پاک رزق ہم نے انہیں بخشا ہے اور جو حلال کمائیاں ان کو عطا کی ہیں ان میں سے وہ خرچ کرتے ہیں۔ پھر خرچ سے مراد بھی ہر طرح کا خرچ نہیں ہے بلکہ اپنی اور اپنے اہل وعیال کی جائز ضروریات پوری کرنا، رشتہ داروں اور ہمسایوں اور حاجت مند لوگوں کی مدد کرنا، رفاہِ عام کے کاموں میں حصہ لینا، اور اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے مالی ایثار کرنا مراد ہے۔ بے جا خرچ، اور عیش وعشرت کے خرچ اور ریا کارانہ خرچ وہ چیز نہیں ہے جسے قرآن ''انفاق'' قرار دیتا ہو۔ بلکہ یہ اس کی اصطلاح میں اسراف اور تبذیر ہے۔ اسی طرح کنجوسی اور تنگ دلی کے ساتھ جو خرچ کیا جائے کہ آدمی اپنے اہل وعیال کو بھی تنگ رکھے اور خود بھی اپنی حیثیت کے مطابق اپنی ضرورتیں پوری نہ کرے، اور خلق خدا کی مدد بھی اپنی استطاعت کے مطابق کرنے سے جی چرائے، تو اس صورت میں اگرچہ آدمی خرچ تو کچھ نہ کچھ کرتا ہی ہے، مگر قرآن کی زبان میں اس خرچ کا نام ''اِنفاق'' نہیں ہے۔ وہ اس کو ''بخل'' اور شُحِّ نفس'' کہتا ہے۔ (تفہیم القرآن، ج ۳، ص ۲۲۶)

آیت 4:

﴿ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۭ ﴾

يُؤْمِنُوْنَ (ء م ن): البقرۃ آیت 3 دیکھیں۔

بِمَآ ''ب'' حرف جارہ ہے اور ''ما'' استفہامیہ، مصدریہ یا موصولہ ہوسکتا ہے۔ 'ما' استفہامیہ ہونے کی صورت میں الف حذف کر دیا جاتا ہے اور بِمَ لکھا جاتا ہے تاکہ 'ما' استفہامیہ اور 'ما' موصولہ میں فرق ہو سکے۔

ن ز ل

(ض) نُزُوْلًا اُترنا۔ بلندی سے کسی چیز کا نیچے آنا۔ اس کی ضد صعود اور عروج دونوں ہیں۔ ﴿ وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا ۭ ﴾ (57/الحدید:4) ''اور جو کچھ آسمان سے اُترتا ہے اور جو کچھ اُس میں چڑھتا ہے۔'' ﴿ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ ﴾ (57/الحدید:16) ''اور جو اُترا حق میں سے۔''

مَنْزِلٌ ج: مَنَازِلُ۔ اسم الظرف ہے۔ اُترنے کی جگہ۔ ٹھہرنے کی جگہ۔ ﴿ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاۗءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ ﴾ (10/یونس:5) ''وہ ہے جس نے بنایا سورج کو روشن اور چاند کو نور اور اس کے لئے طے کر دیں منزلیں۔''

نَزْلَةً نَزَلَ کا اسم مرۃ ہے۔ ایک بار کا نزول۔ ایک مرتبہ اُترنا۔ ﴿ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۙ ﴾ (53/النجم:13) ''اور انہوں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس (فرشتہ) کو ایک بار اور بھی اترتے دیکھا ہے۔''

نُزُلٌ اسم ذات ہے۔ وہ چیز جو مہمان کے سواری سے اُترتے ہی یعنی آتے ہی اصل دعوت سے پہلے پیش کی جائے۔ ابتدائی مہمان نوازی۔ حضرت مفتی شفیع فرماتے ہیں: ''نُزُلٌ اصلاً مہمان کی اس خاطر تواضع کو کہا جاتا ہے جو اصل دعوت سے پہلے کی جائے۔ بعد کے کھانے کو ضیافۃ یا مأدبۃ کہتے ہیں۔'' (معارف القرآن، ج ۷، ص ۷۷۳) ﴿ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ﴾ (18/الکہف:102) ''یقیناً ہم نے تیار کیا جہنم کو کافروں کے لئے ابتدائی مہمان نوازی کے طور پر۔''

(افعال) اِنْزَالًا اُتارنا۔ اتارنے کے لیے انزال کا لفظ عام ہے۔ یہ لفظ کسی چیز کو مکمل طور پر ایک ہی دفعہ اتارنے کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ ﴾ (2/البقرہ:174) ''بیشک وہ لوگ چھپاتے ہیں اس کو جو اُتارا اللہ نے الکتاب میں سے۔'' قرآن مجید میں لباس، مویشی اور لوہے کے اتارنے کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے مثلاً ﴿ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ ﴾ (7/الاعراف:26) ''اے اولاد آدمؑ کی ہم نے اتاری تم پر پوشاک جو ڈھانکے تمہاری شرمگاہیں اور اتارے آرائش کے کپڑے۔'' حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اس آیت میں اَنْزَلْنَا کے لفظ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''اتارنے سے مراد اُس کا مادہ وغیرہ پیدا کرنا اور اُس

کے تیار کرنے کی تدبیر بتلانا ہے۔ گو اتارنے کا لفظ اکثر اس موقع پر بولتے ہیں جہاں ایک چیز کو اوپر سے نیچے لایا جائے۔ مگر بہت دفعہ اس سے مکانی فوق وتحت مراد نہیں ہوتا۔ بلکہ جو مرتبہ کے اعتبار سے اُونچا ہو، اس کی طرف سے کوئی چیز نیچے والوں کو عطا کیے جانے پر بھی یہ لفظ اطلاق کیا جاتا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ؕ﴾ (39/الزمر:6) یا ﴿وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ﴾ (57/الحدید:25) (تفسیر عثمانی، ص ۲۰۴)۔ اِنْزَالٌ کا لفظ خَلْقٌ (پیدا کرنا) کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ الاعراف 26 میں اَنْزَلْنَا کے لفظ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''اَنْزَلْنَا کے لفظی معنی تو اتارنے کے ہیں۔ یہاں خَلَقْنَا کا مرادف قرار دیا گیا ہے۔ لفظ انزال میں اس کی برکتوں کی طرف اشارہ ہے کہ گویا وہ آسمان سے اُترا ہوا ہے۔ غور کیا جائے تو ہر لباس اپنی تیاری کے لیے اسباب آسمانی ہی کا محتاج نظر آئے گا۔ ریشم، اُون، سوت، سب کی پیداوار کے آخری، ظاہری اسباب جا کر بارش ہی پر ٹھہرتے ہیں۔ (تفسیر ماجدی، ص ۳۶۷)۔ چنانچہ حضرتؒ آیت کا ترجمہ کرتے ہیں: ''اے بنی آدم ہم نے تمہارے لیے لباس پیدا کیا ہے جو تمہارے پردہ والے بدن کو چھپاتا ہے اور موجب زینت بھی ہے۔'' اسی طرح سورۃ الزمر آیت 6 میں بھی انزل کے لفظ کا ترجمہ پیدا کیے سے ہی کرتے ہیں۔ ''اور تمہارے لیے اُس نے چار پایوں کے آٹھ (تعداد میں) جوڑے پیدا کیے۔'' پیر کرم شاہ صاحبؒ الاعراف 26 کے تحت فرماتے ہیں: ''اَنْزَلْنَا کا لفظی معنی تو اُوپر سے نیچے اتارنا ہے۔ یہاں لباس کے لیے اس کا استعمال بطور مجاز (مجاز یعنی کہ ظاہری معنی کے علاوہ جو معنی لیے جاتے ہیں) ہے یعنی بارش جو کپاس وغیرہ کی روئیدگی اور حیوانات (جن کی اُون سے گرم کپڑے بنتے ہیں) کی زندگی کا سبب ہے۔ وہ کیونکہ اُوپر سے نازل ہوتی ہے تو گویا لباس بھی اُوپر سے ہی نازل ہوا۔ تَسْمِيَةُ الْمُسَبَّبِ بِاسْمِ السَّبَبِ (مسبب کا نام سبب والا رکھنا، یہاں مسبب لباس ہے اور سبب بارش) اور بعض علما نے کہا انزل بمعنی خلق ہے۔ اور یہ استعمال بھی عام ہے۔ جیسے ﴿وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ؕ﴾ (39/الزمر:6) (ضیاء القرآن، ج ۲، ص: ۲۲)۔ اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ انزال کا لفظ اتارنے کے لیے عام ہے۔ مرتبہ کے اعتبار سے جو اونچا ہو، اس کی طرف سے نیچے والوں کو کوئی چیز ملے تو اس پر بھی اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے اور خلق (پیدا کرنا) کے معنوں میں بھی اس کا استعمال عام ہے۔ (واللہ اعلم)

مُنْزِلٌ ج: مُنْزِلُوْنَ- اسم الفاعل ہے۔ اُتارنے والا۔ میزبان۔ مہمان نواز۔ ﴿اَلَا تَرَوْنَ اَنِّيْٓ اُوْفِي الْكَيْلَ وَ اَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ۝﴾ (12/یوسف:59) ''کیا تم لوگ دیکھتے نہیں کہ میں پورا ناپتا ہوں پیمانے کو اور میں سب سے بہتر ہوں اُتارنے والوں میں یعنی بہترین مہمان نواز ہوں۔''

مُنَزَّلٌ ج: مُنَزَّلُوْنَ- اسم المفعول ہے۔ اُتارا ہوا۔ ﴿اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ۝﴾ (3/آل عمران:124) ''کہ تم لوگوں کی مدد کرے تمہارا رب تین ہزار فرشتوں سے جو اُتارے گئے۔''

(تفعیل) **تَنْزِيْلًا** کسی چیز کو بتدریج اُتارنا۔ رفتہ رفتہ اتارنا۔ ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ؕ﴾ (2/البقرہ:176) ''یہ اس لئے کہ اللہ نے بتدریج اُتارا الکتاب کو حق کے ساتھ۔'' ﴿وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ﴾ (17/بنی اسرائیل:82) ''اور ہم بتدریج اُتارتے ہیں قرآن میں سے جو شفاء ہے اور رحمت ہے مومنوں کیلئے۔''

مُنَزِّلٌ اسم الفاعل ہے۔ بتدریج اُتارنے والا۔ رفتہ رفتہ اتارنے والا۔ ﴿قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۚ﴾ (5/المآئدہ:115) ''کہا اللہ نے کہ میں بتدریج اُتارنے والا ہوں اس کو تم لوگوں پر۔''

مُنَزَّلٌ اسم المفعول ہے۔ بتدریج اُتارا ہوا۔ ﴿وَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ﴾ (6/الانعام:114) ''اور جن لوگوں کو ہم نے دی الکتاب وہ لوگ جانتے ہیں کہ وہ (یعنی قرآن) بتدریج اُتارا ہوا ہے

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رب کی جانب سے حق کے ساتھ۔''

(تفعّل) تَنَزُّلًا ٹھہر ٹھہر کر اُترنا۔اُترتے رہنا۔ ﴿ اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا تَتَنَزَّلُ عَلَیۡہِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ ﴾ (41/حٰمٓ السجدۃ:30) ''بیشک جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر وہ لوگ ڈٹے رہے (یعنی اپنے قول پر) تو اُترتے رہتے ہیں ان لوگوں پر فرشتے۔'' امام راغبؒ فرماتے ہیں: ''جو کلام افتراء اور جھوٹ ہو یا شیاطین کی طرف سے القاء کیا گیا ہو اسکے متعلق صرف تَنَزُّلٌ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔اس لیے کہ باب تفعّل میں تکلّف اور بناوٹ کی خاصیت ہوتی ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَمَا تَنَزَّلَتۡ بِہِ الشَّیٰطِیۡنُ ﴾ (26/الشعراء:210) ''اور اس قرآن کو شیطان لے کر نازل نہیں ہوئے۔'' (مفردات القرآن)

قَبْلُ (مادہ ق ب ل، تفصیل سے انشاء اللہ اسی سورہ کی آیت 48 کے تحت آئے گا۔ یہاں آیت کی مناسبت سے صرف قَبْلُ لکھا جا رہا ہے)۔

قَبْلُ (پہلے)، ظرف زمان بھی ہے اور ظرف مکان بھی۔اس کی ضد بَعْدُ ہے۔قَبْلُ چار طرح استعمال ہوتا ہے۔(1) تقدم مکانی یعنی کسی مقام کا دوران سفر پہلے آنا اور دوسرے کا اس کے بعد آنا جیسے فیصل آباد سے گوجرانوالہ جاتے ہوئے مانوالہ، شیخوپورہ سے پہلے آتا ہے اور گوجرانوالہ سے فیصل آباد آتے ہوئے شیخوپورہ، مانوالہ سے پہلے آتا ہے۔(2) تقدم زمانی یعنی کسی انسان کا زمانہ کسی دوسرے انسان کے زمانے سے پہلے ہونا۔جیسے عَبْدُ الْمَلِکِ قَبْلَ الْمَنْصُوْرِ کہ عبدالملک کا زمانہ منصور سے پہلے کا ہے۔(3) تقدم بلحاظ مرتبہ یعنی مرتبے میں کسی سے بڑا ہونا جیسے عَبْدُ الْمَلِکِ قَبْلَ الْحَجَّاجِ کہ عبدالملک حجاج سے پہلے ہے یعنی مرتبہ میں بڑا ہے۔(4) ترتیب تعلیمی میں ایک چیز کا دوسری سے پہلے ہونا جیسے کہا جاتا ہے کہ تَعَلُّمُ الْھِجَاءِ قَبْلَ تَعَلُّمُ الْخَطِّ کہ حروف ہجاء کی تعلیم کتابت سیکھنے سے پہلے دی جاتی ہے۔ان چار استعمالات کے علاوہ قبل سے مراد ''بغیر'' بھی ہوتا ہے مثلاً ﴿ قَالَ فِرۡعَوۡنُ اٰمَنۡتُمۡ بِہٖ قَبۡلَ اٰذَنَ لَکُمۡ ﴾ (7/الاعراف:123) ''فرعون بولا تم ایمان لے آئے بغیر اس کے کہ میں تمہیں اجازت دوں۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔اسی آیت کے تحت حضرت مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ فرماتے ہیں: ''قبل سے مراد ہمیشہ پیشتر ہی نہیں ہوتا۔ ''بغیر'' بھی مراد ہوتا ہے۔جیسا کہ قرآن مجید کی ایک دوسری آیت میں آیا ہے لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ کَلِمٰتُ رَبِّیْ (کہف۔ ۱۰۹) یا اس حدیث میں وارد ہوا ہے۔اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ عَیْنَیْنِ ھَطَّالَتَیْنِ تَسْقِیَانِ الْقَلْبَ بِذُرُوْفِ الدَّمْعِ مِنْ خَشْیَتِکَ قَبْلَ اَنْ تَکُوْنَ الدَّمْوْعُ دَمًا وَالْاَضْرَاسُ جَمْرًا ''اے اللہ مجھے عطا فرمائیے ایسی زیادہ آنسو بہانے والی آنکھیں جو دل کو سیراب کریں آنسوؤں کے موتیوں کے ساتھ آپ کے خوف سے نہ یہ کہ (یا اس سے پہلے کہ) آنسو خون بن جائیں اور داڑھیں انگارہ بن جائیں۔'' قَبْلُ ہمیشہ اضافت کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔(ا) اگر اس کا مضاف الیہ مذکور ہو (یعنی ذکر کیا جائے) اور اس پر حرف جر بھی داخل ہو تو پھر قَبْلُ زیر قبول کرتا ہے جیسے مِنْ قَبْلِھِمْ، مِنْ قَبْلِکُمْ وغیرہ۔(ب) اگر اس کا مصاف الیہ مذکور نہ ہو اور اس پر حرف جر داخل ہو تو پھر قَبْلُ پیش کے ساتھ لکھا جاتا ہے جیسے ھٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ (البقرۃ:25) (ج) اگر اس پر حرف جر داخل نہ ہو تو پھر یہ زبر کے ساتھ لکھا جاتا ہے جیسے ﴿ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِھَا ﴾ (طٰہٰ:130)۔

ء	خ	ر

(x) x ثلاثی مجرد سے فعل استعمال نہیں ہوتا۔

(تفعیل) تَاْخِیْرًا پیچھے کرنا۔مؤخر کرنا۔مہلت دینا۔ڈھیل دینا۔ ﴿ یُنَبَّؤُا الۡاِنۡسَانُ یَوۡمَئِذٍۭ بِمَا قَدَّمَ وَ اَخَّرَ ﴾ (75/القیامۃ:13) ''جتلا دیا جائے گا اس دن انسان کو جو اس نے آگے کیا اور جو اس نے پیچھے کیا۔'' ﴿ وَ لَنۡ یُّؤَخِّرَ اللّٰہُ نَفۡسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُہَا ﴾ (63/المنافقون:11) ''اور اللہ ہرگز پیچھے نہیں کرے گا (یعنی ہرگز مہلت نہیں دے گا) کسی نفس کو جب آجائے گی اس کی اجل (یعنی موت)۔''

(تفعّل) تَاَخُّرًا پیچھے رہنا۔ ﴿ نَذِیۡرًا لِّلۡبَشَرِ لِمَنۡ شَآءَ مِنۡکُمۡ اَنۡ یَّتَقَدَّمَ اَوۡ یَتَاَخَّرَ ﴾ (74/المدثر:36-37) ''وارننگ ہے ہر اس شخص کے لئے جو چاہے تم میں سے کہ وہ آگے رہے یا پیچھے رہے۔''

(استفعال) اِسْتِئْخَارًا پیچھے ہونا۔ ﴿فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۳۴﴾﴾ (7/الاعراف:34) ''تو جب آ جائے گی ان لوگوں کی اجل تو نہ وہ لوگ پیچھے ہوں گے ایک گھڑی اور نہ آگے ہوں گے۔''

مُسْتَاْخِرٌ اسم الفاعل ہے۔ پیچھے رہنے والا اور وہ جو ابھی پیدا نہیں ہوا۔ ﴿وَ لَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَ لَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ ﴿۲۴﴾﴾ (15/الحجر:24) ''اور ہم نے جان رکھا ہے آگے بڑھنے والوں کو تم میں سے اور جان رکھا ہے پیچھے رہنے والوں کو۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔ ''پہلے جو لوگ تم میں سے ہو گزرے ہیں اُن کو بھی ہم نے دیکھ رکھا ہے، اور بعد کے آنے والے بھی ہماری نگاہ میں ہیں۔'' (ترجمہ تفہیم القرآن)

آخِرٌ فاعل کا وزن ہے۔ آخری۔ ﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸﴾﴾ (2/البقرہ:8) ''اور لوگوں میں سے وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اللہ پر اور آخری دن پر حالانکہ وہ لوگ مومن نہیں ہیں۔''

اٰخِرَةٌ یہ ضد ہے دنیا کی۔ دنیا مشتق ہے دُنُوٌّ سے جس کے معنی قریب ہونا کے ہیں خواہ یہ قرب ذاتی، حکمی، مکانی، زمانی یا بلحاظ مرتبہ کے ہو۔ چونکہ وہ حال کے بہت ہی قریب ہے اس لیے اسے دنیا کہتے ہیں۔ اسی طرح آخرت کو اس کے متاخر اور پیچھے ہونے کی وجہ سے آخرت کہتے ہیں۔ اصل میں دنیا اور آخرت دونوں دو صفتیں تھیں اب ان پر اسمیت غالب آئی اور استعمال میں دنیا و آخرت اسم کہلائے جانے لگے۔ اصل میں آخرت کا معنی دارالبقا ہے یعنی مرنے کے بعد انسانوں کو دوسرے جہان میں جو دائمی زندگی حاصل ہوگی اور اس زندگی میں رُوح اور جسم دونوں کا کلی طور پر اتصال ہوگا اور نیک اور بدکار لوگوں کو اپنے اپنے اعمال کے بدلے میں جنت یا دوزخ میں داخل کیا جائے گا۔ اسی لحاظ سے آخرت کی ضد عاجلۃ، دنیا، ادنیٰ، اُولیٰ سب قرآن میں استعمال ہوئی ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں: ''اَلْاٰخِرَةُ سے مراد ہے دارالآخرت یا عالم آخرت۔ یعنی وہ عالم جو موجودہ زندگی کے بعد شروع ہوگا۔ اُسے آخرۃ کہا ہی اسی لحاظ سے جاتا ہے کہ وہ اِس زندگی کے خاتمہ کے بعد پیش آئے گا۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر کہیں دارالآخرہ سے آیا ہے اور کہیں صرف آخرۃ سے۔ جزا و سزا کے لیے ایک مستقل آئندہ عالم پر یقین رکھنا دین صحیح کے لوازم میں سے ہے۔'' (تفسیر ماجدی، ص۸)۔ مولانا مودودیؒ نے اس لفظ کی بہت خوبصورت وضاحت کی ہے وہ آگے نوٹ 2 میں دیکھیں۔

آخَرُ ج: اٰخَرُوْنَ، اٰخِرِيْنَ۔ اَفْعَلُ کا وزن ہے۔ دوسرا۔ ﴿الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۚ﴾ (15/الحجر:96) ''وہ لوگ جو بناتے ہیں اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود۔'' ﴿كَمَاۤ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ﴿۱۳۳﴾﴾ (6/الانعام:133) ''جس طرح اُس نے تمہیں کچھ اور لوگوں کی نسل سے اُٹھایا ہے۔''

اُخْرٰی فُعْلٰی کے وزن پر اٰخَرُ کا مونث ہے۔ دوسری۔ اس کی جمع فُعَلٌ کے وزن پر اُخَرٌ آنی چاہیے تھی لیکن خلافِ قاعدہ اُخَرُ (غیر منصرف) آتی ہے۔ ﴿وَ اُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ؕ﴾ (61/الصّف:13) ''اور دوسری تم لوگ پسند کرتے ہو جس کو۔'' ﴿فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ﴾ (2/البقرہ:184) ''تو گنتی ہے دوسرے دنوں میں۔'' کبھی اس کا معنی ''پیچھے سے، پچھلی طرف سے'' ہوتا ہے جیسے فرمایا ﴿وَّ الرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِيْۤ اُخْرٰىكُمْ﴾ (3/آل عمران:153) ''اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم پکارتا تھا تم کو تمہارے پیچھے سے۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) کبھی اس سے مراد ''بعد والا یا بعد والی'' ہوتا ہے جیسے فرمایا: ﴿حَتّٰۤى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ؕ﴾ (7/الاعراف:38) ''حتیٰ کہ جب سب وہاں جمع ہو جائیں گے تو ہر بعد والا گروہ پہلے گروہ کے حق میں کہے گا کہ اے ربّ! یہ لوگ تھے جنہوں نے ہم کو گمراہ کیا لہٰذا انہیں آگ کا دوہرا عذاب دے۔'' اس آیت کے تحت صاحبؒ احسن البیان

فرماتے ہیں: ’’اُخْرٰی (پچھلے) سے مراد بعد میں داخل ہونے والے اور اُوْلٰی (پہلے) سے مراد ان سے پہلے داخل ہونے والے ہیں۔‘‘ اور کبھی اُخْرٰی مطلقاً ’’دوسرے‘‘ کے معنی میں بھی آتا ہے جس میں مقدم اور مؤخر کا مفہوم نہیں ہوتا چنانچہ فرمایا: ﴿وَ لَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰٓى ﴾ (20/طٰہٰ:37) ’’اور احسان کیا تھا ہم نے تجھ پر ایک بار اور بھی۔‘‘ حضرت مفتی محمد شفیعؒ اس آیت میں اُخْرٰی کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ’’یہ نعمتیں جن کا ذکر آگے آتا ہے زمانہ وقوع کے اعتبار سے پہلی ہیں یہاں جو اُن کو اُخْرٰی کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ نعمتیں اس کے بعد کی ہیں بلکہ لفظ اُخْرٰی کبھی مطلقاً دوسرے کے معنی میں بھی آتا ہے جس میں مقدم مؤخر کا کوئی مفہوم نہیں ہوتا یہاں بھی یہ لفظ اسی معنی میں ہے۔‘‘ (معارف القرآن، ج ٦ ص ٨٢)

ی ق ن

(س) يَقَنًا: روشن وثابت ہونا۔ قرآن مجید میں ثلاثی مجرد سے فعل استعمال نہیں ہوا۔

يَقِيْنٌ: فَعِيْلٌ کے وزن پر صفت ہے۔ کسی چیز کا ثبوت کے ساتھ ہمیشہ کے لئے سمجھ میں آجانا۔ یقین آنا۔ یقین، زوالِ شک کو کہتے ہیں۔ یقین اس چیز کو بھی کہتے ہیں جس کا ہونا یقینی ہو اسی لیے عربی میں یقین بمعنی موت بھی استعمال ہوتا ہے۔ ﴿وَ كُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۙ حَتّٰٓى اَتٰىنَا الْيَقِيْنُ ؕ﴾ (74/المدثر:46-47) ’’اور ہم جھٹلایا کرتے تھے بدلے کے دن کو یہاں تک کہ آیا ہم کو یقین۔‘‘ اس آیت میں اکثر مفسرین نے یقین سے موت مراد لی ہے۔
(ایمان اور یقین میں فرق کے لیے البقرۃ آیت 3 دیکھیں)۔

(افعال) اِيْقَانًا: یقین کرنا۔ ﴿قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴾ (2/البقرہ:118) ’’ہم واضح کر چکے ہیں نشانیوں کو ایسی قوم کے لئے جو یقین کرتے ہیں۔‘‘

مُوْقِنٌ: ج: مُوْقِنُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ یقین کرنے والا۔ ﴿وَ كَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ﴾ (6/الانعام:75) ’’اور اس طرح ہم نے دکھائی ابراہیمؑ کو زمین اور آسمانوں کی بادشاہت اور اس لئے کہ وہ ہو جائے یقین کرنے والوں میں سے۔‘‘

(استفعال) اِسْتِيْقَانًا: یقین حاصل کرنا۔ یقین کے ساتھ جان لینا۔ واضح طور پر جان لینا۔ ﴿وَ مَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۙ لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ﴾ (74/المدثر:31) ’’اور ہم نے نہیں بنایا ان کی گنتی کو مگر آزمائش ان لوگوں کے لئے جنہوں نے کفر کیا، تاکہ یقین حاصل کریں وہ لوگ جنہیں دی گئی کتاب۔‘‘

مُسْتَيْقِنٌ: ج: مُسْتَيْقِنُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ یقین حاصل کرنے والا۔ ﴿قُلْتُمْ مَّا نَدْرِيْ مَا السَّاعَةُ ۙ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّ مَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ ﴾ (45/الجاثیہ:32) ’’تم لوگوں نے کہا ہم نہیں جانتے قیامت کیا ہے، ہم گمان نہیں کرتے مگر ایک گمان یعنی کچھ گمان سا ہوتا ہے اور ہم یقین حاصل کرنے والے نہیں ہیں۔‘‘

ترکیب یہ پوری آیت بھی آیت 2 میں اَلْمُتَّقِيْنَ کی صفت ہے۔ ’وَ‘ عطف کا ہے اور اَلَّذِيْنَ عطف ہے آیت 3 کے اَلَّذِيْنَ پر۔ يُؤْمِنُوْنَ اس کا صلہ ہے۔ بِمَا میں ’ما‘ اسم موصول ہے اور اُنْزِلَ اس کا صلہ۔ اُنْزِلَ ماضی مجہول کا صیغہ ہے اور اس میں شامل ضمیر ’’هُوَ‘‘ اس کا نائب الفاعل ہے۔ اِلَيْكَ متعلق ہے اُنْزِلَ سے۔ آگے ’وَمَا‘ میں ’وَ‘ عطف کا ہے اور ’مَا‘، بِمَا کے ’مَا‘ پر عطف ہے۔ اُنْزِلَ اس کا صلہ ہے۔ مِنْ قَبْلِكَ متعلق ہے اُنْزِلَ سے۔ بِالْاٰخِرَةِ، جار مجرور متعلق ہیں يُوْقِنُوْنَ سے اور ’هُمْ‘ مبتدا ہے اور يُوْقِنُوْنَ اس کی خبر۔ بِالْاٰخِرَةِ کو تاکید اور حصر کے لیے مقدم کیا گیا ہے اور اَلْاٰخِرَةِ صفت ہے۔ اس کا موصوف محذوف ہے۔ اَلْاٰخِرَةِ مونث ہے اس لئے اس کا موصوف مذکر نہیں ہو سکتا لازماً مونث ہوگا جیسے وَبِالسَّاعَةِ الْاٰخِرَةِ یعنی آخری گھڑی پر۔ (واللہ اعلم)۔

ترجمہ	وَالَّذِيْنَ	يُؤْمِنُوْنَ	بِمَآ	اُنْزِلَ	اِلَيْكَ	وَمَآ	اُنْزِلَ
البقرۃ:4	اور وہ لوگ جو	ایمان لاتے ہیں	اس پر جو	اُتارا گیا	آپ ﷺ کی طرف	اور جو	اُتارا گیا

مِنْ قَبْلِكَ	وَبِالْاٰخِرَةِ	هُمْ	يُوْقِنُوْنَ ④
آپ ﷺ سے پہلے	اور آخرت پر	وہ لوگ	یقین کرتے ہیں

نوٹ:1 | اِنْزَالٌ اور تَنْزِيْلٌ دونوں کے معنی ہیں اُتارنا۔ جبکہ ان میں فرق یہ ہے کہ اِنْزَالٌ میں زیادہ تر کسی چیز کو ایک دفعہ اُتارنے کا مفہوم ہوتا ہے۔ اور تَنْزِيْلٌ میں کسی چیز کو رفتہ رفتہ اُتارنے کے معنی ہوتے ہیں۔ نزولِ قرآن کے لئے اِنْزَالٌ اور تَنْزِيْلٌ، دونوں کے مختلف صیغے استعمال ہوئے ہیں۔ اس کو سمجھنے میں ایک حدیث سے مدد ملتی ہے جس کا مفہوم ہے کہ قرآن پاک پہلے لوح محفوظ سے ایک ہی دفعہ آسمانِ دنیا پر نازل ہوا (انزال) پھر وہاں سے رفتہ رفتہ نازل ہوتا رہا (تنزیل)۔

نوٹ:2 | آخرت: آخرت ایک جامع لفظ ہے جس کا اطلاق بہت سے عقائد کے مجموعے پر ہوتا ہے۔ اس میں حسب ذیل عقائد شامل ہیں:

(۱) یہ کہ انسان اس دُنیا میں غیر ذمہ دار نہیں ہے بلکہ اپنے تمام اعمال کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔

(۲) یہ کہ دُنیا کا موجودہ نظام ابدی نہیں ہے بلکہ ایک وقت پر، جسے صرف خدا ہی جانتا ہے، اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔

(۳) یہ کہ اس عالم کے خاتمے کے بعد خدا ایک دوسرا عالم بنائے گا اور اس میں پوری نوعِ انسانی کو جو ابتدائے آفرینش سے قیامت تک زمین پر پیدا ہوئی تھی، بیک وقت دوبارہ پیدا کرے گا، اور سب کو جمع کر کے ان کے اعمال کا حساب لے گا، اور ہر ایک کو اس کے کیے کا پورا پورا بدلہ دے گا۔

(۴) یہ کہ خدا کے اس فیصلے کی رُو سے جو لوگ نیک قرار پائیں گے وہ جنت میں جائیں گے اور جو لوگ بد ٹھہریں گے وہ دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔

(۵) یہ کہ کامیابی و ناکامی کا اصلی معیار موجودہ زندگی کی خوشحالی و بدحالی نہیں ہے، بلکہ درحقیقت کامیاب انسان وہ ہے جو خدا کے آخری فیصلے میں کامیاب ٹھہرے، اور ناکام وہ ہے جو وہاں ناکام ہو۔

عقائد کے اِس مجموعے پر جن لوگوں کو یقین نہ ہو وہ قرآن سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتے، کیونکہ ان باتوں کا انکار تو درکنار، اگر کسی کے دل میں ان کی طرف سے شک اور تذبذب کی کیفیت بھی ہو، تو وہ اس راستہ پر نہیں چل سکتا جو انسانی زندگی کے لیے قرآن نے تجویز کیا ہے۔ (تفہیم القرآن، ج ۱، ص ۵۱)

آیت:5

﴿ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۖ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ⑤ ﴾

هُدًى (ھ د ی): الفاتحہ آیت 5 دیکھیں۔ رَبٌّ (ر ب ب): الفاتحہ آیت 1 دیکھیں۔

ف ل ح

(ن) فَلْحًا: پھاڑنا۔ زمین میں ہل چلانا۔ عربی میں کہا جاتا ہے اَلْحَدِيْدُ بِالْحَدِيْدِ يُفْلَحُ۔ لوہا، لوہے کو کاٹتا ہے۔ پھر فَلَّاحٌ کسان کو کہتے ہیں کیونکہ وہ زمین کو پھاڑتا ہے (بیج بونے کے لیے)۔ ثلاثی مجرد سے فعل یا اسم قرآنِ مجید میں استعمال نہیں ہوا۔

(افعال) فَلَاحًا: اس کا مصدر اِفْلَاحٌ کے بجائے فَلَاحٌ استعمال ہوتا ہے۔ کامیاب ہونا۔ مراد پالینا۔ مشکلات اور رکاوٹوں کو پھاڑ کے یعنی عبور کر کے اپنا مطلوب حاصل کر لینا۔ (فعل لازم ہے)۔ فلاح ایسی کامیابی کو کہتے ہیں جو کسی کی اپنی محنت اور عمل کے نتیجے میں ہو۔ یہ لفظ خُسران کی ضد ہے جس کا معنی نقصان اور گھاٹا ہے۔ امام راغبؒ فرماتے ہیں، فَلَاحٌ کے معنی کامیابی کے ہیں۔ اس کی دو قسمیں ہیں (۱) دنیوی (۲) اُخروی۔ دنیوی فلاح ان سعادتوں کو حاصل کر لینے کا نام ہے جن

سے دنیاوی زندگی خوشگوار ہوتی ہے یعنی بقاء مال اور عزت و دولت۔ اخروی فلاح چار چیزوں کو حاصل کرنے کا نام ہے۔ (ا) بقا بلا فنا (ب) غنا بلا فَقْرٌ (ج) عزت بلا ذلت (د) علم بلا جہالت۔ اسی لیے کہا گیا ہے لَاعَیْشَ اِلَّا عَیْشَ الْاٰخِرَۃِ۔ یعنی آخرت کی زندگی ہی اصل زندگی ہے۔ (مفردات القرآن۔ تلخیصاً)۔ حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں: ''فلاح عربی میں بڑے ہی وسیع معنی میں آتا ہے۔ دنیا و آخرت کی ساری خوبیوں کا جامع ہے۔ اس لیے المفلحون کا پورا ترجمہ ''کامیاب'' ''بامراد'' وغیرہ کسی اُردو لفظ سے ہونا دشوار ہی ہے۔ امام لغت زبیدی کا قول ہے کہ ائمۂ لسان کا اس پر اتفاق ہے کہ کلام عرب میں جامعیت خیر کے لیے فلاح سے بڑھ کر کوئی لفظ موجود نہیں۔ لَیْسَ فِیْ کَلَامِ الْعَرَبِ کُلِّہٖ اَجْمَعُ مِنْ لَفْظَۃِ الْفَلَاحِ لِخَیْرَیِ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ کَمَا قَالَ اَئِمَّۃُ اللِّسَانِ (تاج)۔'' (تفسیر ماجدی، ص ۸)۔ یہی بات پیر کرم شاہ صاحبؒ نے اِن الفاظ میں بیان کی ہے: ''فلاح کسی ادھوری اور جزوی کامیابی کو نہیں کہتے بلکہ فلاح اس مکمل کامیابی کو کہا جاتا ہے جس کے دامن میں دنیا و آخرت کی ساری سعادتیں اور برکتیں سمٹ آئی ہوں۔ لیس فی کلام ... ائمۃ اللسان (تاج)۔'' ائمہ لغت نے تصریح کی ہے کہ عربی زبان میں فلاح کے لفظ سے زیادہ اور کوئی لفظ نہیں جو دنیا و آخرت دونوں کی خیرات و برکات پر دلالت کرتا ہو۔'' (ضیاء القرآن، ج ۱، ص ۳۲)۔

مُفْلِحٌ ج: مُفْلِحُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ مراد پانے والا۔ ''قرآن مجید میں مفلحون کا لفظ صرف انہی لوگوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو آخرت میں فلاح پانے والے (ہیں)۔ اخروی کامیابی کے دروازے جن کے لیے کھول دیئے جائیں گے، ہاں اَفْلَحَ کا لفظ ایک جگہ فرعون و موسیٰ کے قصہ میں دنیوی کامیابی کے لیے استعمال کیا گیا وہ بھی اللہ کا مقولہ نہیں ہے بلکہ دوسروں کا مقولہ اللہ نے نقل کیا ہے، فرمایا ہے ﴿وَقَدْ اَفْلَحَ الْیَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰی ۝﴾ (20/طٰہٰ:64) ''آج جو غالب آئے گا وہی کامیاب ہوگا۔'' (لغات القرآن)

ترکیب اُولٰٓئِکَ کا اشارہ گذشتہ آیت نمبر 2 میں اَلْمُتَّقِیْنَ کی طرف ہے۔ نیز اس آیت میں اُولٰٓئِکَ مبتداء ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ عَلٰی ھُدًی قائم مقام خبر ہے۔ ھُدًی نکرہ موصوفہ ہے اور مِّنْ رَّبِّھِمْ اس کی صفت ہے۔ آگے اُولٰٓئِکَ مبتدا ہے اَلْمُفْلِحُوْنَ اس کی خبر اور درمیان میں ھُمْ ضمیر فاصل ہے جو حصر کا مفہوم پیدا کر رہی ہے۔

ترجمہ
البقرۃ:5

اُولٰٓئِکَ	عَلٰی ھُدًی	مِّنْ رَّبِّھِمْ ق	وَاُولٰٓئِکَ	ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝
یہی لوگ	ہدایت پر ہیں	اپنے رب کی طرف سے	اور یہ لوگ	ہی مراد پانے والے ہیں

آیت:6

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْھِمْ ءَاَنْذَرْتَھُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝﴾

ك	ف	ر

(ن) کُفْرًا، کُفُوْرًا، کُفْرَانًا کسی چیز کو دبا دینا، کسی چیز کو اس طرح چھپا دینا کہ اس کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے۔ پھر اس بنیادی مفہوم کے ساتھ یہ الفاظ قرآن مجید میں شکر اور ایمان کے مقابلے میں استعمال ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کا مفہوم ہے:

(ا) ناشکری کرنا یا ناقدری کرنا۔ ناشکری کو بھی کفر اس لیے کہا جاتا ہے کہ ناشکرا محسن کے احسانات کو چھپاتا ہے۔ (ب) ایمان لانے سے انکار کرنا۔ دراصل اللہ تعالیٰ کی معرفت، اسکی وحدانیت، نیکی بدی کا شعور، جذبہ شکر وغیرہ انسان کی فطرت میں ڈال کر اسے دنیا کی امتحان گاہ میں بھیجا جاتا ہے۔ یہ چیزیں جب اس کے اندر سے

ابھر کر شعور کی سطح پر آنا چاہتی ہیں تو کچھ لوگ اسے دبا دیتے ہیں یا چھپا لیتے ہیں۔ اسکے بعد ہی وہ اس قابل ہوتے ہیں کہ ناشکری کریں یا انکار کریں۔ کُفْرٌ زیادہ تر دین سے انکار کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ کُفْرَانٌ زیادہ تر نعمت کے انکار اور ناقدری کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور کُفُوْرٌ دونوں قسموں کے انکار پر بولا جاتا ہے۔ اصطلاح شریعت میں جن چیزوں پر ایمان لانا فرض ہے ان میں سے کسی چیز کے انکار کا نام کفر ہے۔ ﴿وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴾ (31/لقمان:12) ''اور جو شکر کرے تو کچھ نہیں سوائے اسکے کہ وہ شکر کرتا ہے اپنے ہی لئے اور جس نے ناشکری کی تو بیشک اللہ بے نیاز، حمد کیا ہوا ہے۔''

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ ﴾ (3/آل عمران:90) ''یقیناً وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ایمان لانے کے بعد پھر بڑھتے چلے گئے کفر میں، ہرگز قبول نہیں کی جائے گی ان کی توبہ۔''

﴿ وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۫ فَاَبٰۤى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴾ (17/بنی اسرائیل:89) ''ہم نے مختلف پیرایوں میں بیان کی ہے لوگوں کیلئے اس قرآن میں ہر طرح کی مثال، تو نہ مانا لوگوں کی اکثریت نے مگر ناشکری کرتے ہوئے۔''

﴿ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ ۚ ﴾ (21/الانبیاء:94) ''تو جو عمل کرے نیکیوں میں سے اس حال میں کہ وہ مومن رہے تو کسی قسم کی کوئی ناقدری نہیں ہے اسکی کوشش کے لئے۔'' کُفْرٌ کا لفظ بطور اسم ذات بھی استعمال ہوتا ہے بمعنی کفر، انکار۔ ﴿ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴾ (2/البقرۃ:108) ''اور جو بدل لیتا ہے کفر کو ایمان سے تو وہ بھٹک گیا سیدھے راستے سے۔''

اُكْفُرْ ج: اُكْفُرُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو کفر کر۔ ﴿ كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ ۚ ﴾ (59/الحشر:16) ''شیطان کی مثال کی مانند جب اس نے کہا انسان سے کہ تو ناشکری کر یا انکار کر۔''

كَافِرٌ ج كَافِرُوْنَ، كُفَّارٌ اور كَفَرَةٌ۔ اسم الفاعل ہے (مذکر)۔ کفر کرنے والا، انکار کرنے والا، ناشکری کرنے والا۔ ﴿ وَ يَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ﴾ (78/النبا:40) ''اور کہے گا انکار کرنے والا اے کاش میں مٹی ہوتا۔'' ﴿ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْۤا اِنَّا بِالَّذِيْۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴾ (7/الاعراف:76) ''وہ متکبر لوگ کہنے لگے ہم تو اُس چیز کے منکر ہیں جس پر تم ایمان لا چکے ہو۔''

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ ﴾ (2/البقرہ:161) ''بیشک جن لوگوں نے انکار کیا اور وہ لوگ مر گئے اس حال میں کہ وہ لوگ انکار کرنے والے ہی رہے، ان لوگوں پر اللہ کی لعنت ہے۔'' ﴿ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ﴾ (80/عبس:42) ''یہی لوگ تو ہیں کافر فاجر۔''

کسان کو بھی كَافِرٌ کہتے ہیں کیونکہ وہ بیج کو زمین میں دبانے اور چھپانے والا ہوتا ہے۔ ﴿ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ ﴾ (57/الحدید:20) بارش کی مثال کی مانند جو بھلی لگی کسانوں کو۔''

رات کو بھی کافر کہتے ہیں کیونکہ وہ سب چیزوں کو چھپا لیتی ہے۔

كَافِرَةٌ ج: كَوَافِرُ۔ اسم الفاعل ہے (مؤنث)۔ انکار کرنے والی۔ ناشکری کرنے والی۔ ﴿ وَ اُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ﴾ (3/آل عمران:13) ''اور دوسری فوج کافروں کی ہے دیکھتے ہیں یہ اُن کو اپنے سے دو چند صریح آنکھوں سے۔'' ﴿ وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ ﴾ (60/الممتحنۃ:10) ''اور تم کافر عورتوں کے تعلقات کو باقی مت رکھو۔''

كَفَّارٌ — فَعَّالٌ کے وزن پر اسم مبالغہ ہے۔بہت ناشکرا، بہت انکار کرنے والا۔﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ﴿٣﴾ ﴾(39/الزمر:3)''یقیناً اللہ ہدایت نہیں دیتا اس کو جو بہت زیادہ انکار کرنے والا جھوٹا ہے۔''

كَفُوْرٌ — فَعُوْلٌ کے وزن پر اسم مبالغہ ہے۔دل کھول کر ناشکری کرنے والا ، انکار کرنے والا۔﴿ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ ﴿٦٦﴾ ﴾ (22/الحج:66)''بیشک انسان دل کھول کر ناشکری کرنے والا ہے۔''

مَآ اَكْفَرَهٗ — صیغہ تعجب ہے جو اظہار تعجب کے لیے استعمال ہوتا ہے۔﴿ قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ﴿١٧﴾ ﴾(80/عبس:17)''(کافر) انسان پر اللہ کی مار، وہ کیسا ناشکرا ہے۔''

(تفعیل) تَكْفِيْرًا — کسی کی ناپسندیدہ چیز کو اس سے دور کرنا، کسی چیز کو اس طرح چھپانا اور ڈھانپنا کہ گویا وہ کبھی تھی ہی نہیں۔ غلطی کا جرمانہ ادا کر کے اس کی سزا کو دور کرنا۔کفارہ ادا کرنا۔﴿ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ ﴿٢﴾ ﴾(47/محمد:2)''اس نے یعنی اللہ نے دور کیا ان کی برائیوں کو ان سے اور اس نے اصلاح کی ان کی حالتوں کی۔''(نوٹ: جوہریؒ فرماتے ہیں کہ ثواب مٹ جائے تو اس کے لیے 'احباط' کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور اگر گناہ معاف کر دیے جائیں تو ان کے لیے 'تکفیر' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔اَلتَّكْفِيْرُ فِي الْمَعَاصِي كَالْاِحْبَاطِ فِي الثَّوَابِ)۔(بحوالہ ضیاء القرآن، ج ۵،ص ۳۰۴)

كَفِّرْ — فعل امر ہے۔تو دور کر۔﴿ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ﴿١٩٣﴾ ﴾ (3/آل عمران:193)''اے ہمارے رب تو بخش دے ہمارے لئے ہمارے گناہوں کو اور تو دور کر دے ہم سے ہماری برائیوں کو اور تو موت دے ہم کو نیک لوگوں کے ساتھ۔''

كَفَّارَةٌ — کفارہ کے لغوی معنی ہیں ''چھپانے والی چیز'' جو چیز گناہ کو دور کر دے اور اسے چھپا دے، کفارہ کہلاتی ہے یعنی گناہ کا شرعی اتار۔کسی نیکی کو گناہ کا ''کفارہ'' قرار دینے کا مطلب ہوتا ہے کہ یہ نیکی اس گناہ پر چھا جائے اور اسے ڈھانپ لے، جیسے کسی دیوار پر داغ لگ جائے اور اس پر سفیدی پھیر کر اسے مٹا دیا جائے۔ نوٹ: کفارہ گناہ سے متعلق ہوتا ہے۔ جبکہ فِدْيَةٌ، عبادت میں کوتاہی سے متعلق ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم)﴿ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ؕ ﴾ (5/المائدۃ:89)''یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب کہ تم قسم کھا کر توڑ دو۔''

س و ی

(س) سِوًى ، سَوَاءً — ہموار ہونا۔حالت یا مقدار میں برابر ہونا۔درمیان میں ہونا۔درست ہونا۔قرآن مجید میں ثلاثی مجرد سے فعل استعمال نہیں ہوا۔البتہ اس کا مصدر سَوَاءٌ آیت زیر مطالعہ میں استعمال ہوا ہے۔

سَوَاءٌ — مصدر کے علاوہ اسم ذات بھی ہے۔(۱) برابر۔﴿ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً ﴾(4/النساء:89) ''یہ لوگ تو دل سے چاہتے ہیں کہ تم بھی کفر کرو جیسے یہ لوگ کفر کر رہے ہیں تا کہ تم (سب) برابر ہو جاؤ''(ترجمہ ماجدیؒ) ﴿ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ﴾(3/آل عمران:64)''تو کہہ اے اہل کتاب آؤ ایک بات کی طرف جو برابر ہے ہم میں اور تم میں۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ)﴿ فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ ﴾(8/الانفال:58)''تو پھینک دے ان کا عہد ان کی طرف ایسی طرح پر کہ ہو جاؤ تم اور وہ برابر۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ)(۲) کسی چیز کا درمیان یا وسط۔﴿ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿١٠٨﴾ ﴾(2/البقرہ:108)''اور جو تبدیل کرتا ہے کفر کو ایمان کے بدلے تو وہ بھٹک گیا ہے راستہ کے درمیان سے یعنی سیدھے راستے سے۔'' ﴿ فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِيْ سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ﴿٥٥﴾ ﴾(37/الصافات:55)''پس اس نے جھانکا تو اس نے دیکھا اس کو بھڑکتی آگ کے وسط میں۔''(۳) پورا، تمام۔﴿ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِيْۤ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ؕ سَوَآءً

﴿ لِّلسَّآئِلِيۡنَ ﴾ (41/حم السجدة:10) ''اور اُسی نے زمین کے اوپر پہاڑ بنا دیے اور اُس (زمین) میں فائدے کی چیزیں رکھ دیں اور اُسی میں اُس (پر رہنے والوں) کی غذائیں رکھ دیں (یہ سب) چار دن میں پورے ہیں پوچھنے والوں کے لیے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ اور حضرت شیخ الہندؒ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيۡنَ کا ترجمہ کرتے ہیں ''پورا ہوا پوچھنے والوں کو۔'' اور پھر حاشیے میں فرماتے ہیں: ''یعنی یہ سب کام چار دن میں ہوا۔ دو روز میں زمین پیدا کی گئی اور دو روز میں اس کے متعلقات کا بندوبست ہوا۔ جو پوچھے یا پوچھنے کا ارادہ رکھتا ہے اُسے بتلا دو کہ یہ سب مل کر پورے چار دن ہوئے بدون کسر اور کمی وبیشی کے۔ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: یعنی (پوچھنے والوں کا) جواب پورا ہوا۔'' نوٹ: نہ اِس کا تثنیہ بنایا جاتا ہے اور نہ جمع۔

سَوِیٌّ: فَعِيۡلٌ کے وزن پر صفت ہے۔ ہر لحاظ سے کمی یا زیادتی سے پاک۔ سیدھا۔ کامل۔ درمیانی۔ ﴿ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ﴾ (19/مریم:10) ''اس نے یعنی اللہ تعالیٰ نے کہا تیری نشانی ہے کہ تو کلام نہیں کرے گا لوگوں سے تین کامل راتیں یعنی تین رات اور دن۔'' یا ''(اللہ نے) فرمایا تمہارے لیے نشان یہ ہے کہ تم لوگوں سے تین راتیں نہ بول سکو گے درآنحالیکہ تم تندرست ہو گے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)

سُوًی: صاف، ہموار۔ درمیانی۔ جس چیز کی دونوں طرفیں برابر ہوں۔ یہ صفت بھی ہے، ظرف بھی ہے اور مصدر بھی۔ ﴿ فَلَنَاۡتِيَنَّكَ بِسِحۡرٍ مِّثۡلِهٖ فَاجۡعَلۡ بَيۡنَنَا وَ بَيۡنَكَ مَوۡعِدًا لَّا نُخۡلِفُهٗ نَحۡنُ وَ لَاۤ اَنۡتَ مَكَانًا سُوًى ﴾ (20/طٰہٰ:58) ''سو ہم بھی لائیں گے تیرے مقابلے میں ایک ایسا ہی جادو سو ٹھہرا لے ہمارے اور اپنے بیچ میں ایک وعدہ نہ ہم خلاف کریں گے اُس کا اور نہ تو ایک میدان صاف میں۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔ آیت میں مَكَانًا سُوًى کے بارے میں صاحبؒ احسن البیان لکھتے ہیں: ''صاف ہموار جگہ، جہاں ہونے والے مقابلے کو ہر شخص آسانی سے دیکھ سکے یا ایسی برابر کی جگہ، جہاں فریقین سہولت سے پہنچ سکیں۔'' (احسن البیان، ص ۸۶۳)

(تفعیل) تَسۡوِيَةٌ: کسی چیز کو کمی یا زیادتی سے پاک کرنا۔ ہر لحاظ سے مناسب وموزوں بنانا یعنی نوک پلک درست کرنا۔ ہموار یا برابر کرنا۔ ﴿ الَّذِيۡ خَلَقَ فَسَوّٰى ﴾ (87/الاعلیٰ:2) ''جس نے پیدا کیا پھر نوک پلک درست کی۔'' ﴿ رَفَعَ سَمۡكَهَا فَسَوّٰىهَا ﴾ (79/النّٰزعٰت:28) ''اس نے بلند کیا اس کی یعنی آسمان کی چھت کو پھر اسے درست کیا۔'' ﴿ اِذۡ نُسَوِّيۡكُمۡ بِرَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴾ (26/الشعراء:98) ''جب ہم تم کو برابر کرتے تھے پروردگار عالم کے۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)

تُسَوّٰی: مضارع مجہول کا صیغہ ہے۔ ﴿ يَوۡمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَ عَصَوُا الرَّسُوۡلَ لَوۡ تُسَوّٰى بِهِمُ الۡاَرۡضُ ﴾ (4/النساء:42) ''جن لوگوں نے کفر کیا ہے اور پیغمبر کی نافرمانی کی ہے وہ اُس روز تمنا کریں گے کہ کاش زمین اُن پر برابر کر دی جائے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)

(مفاعلہ) مُسَاوَاةٌ: دو یا زیادہ چیزوں کو برابر کرنا۔ ﴿ حَتّٰۤى اِذَا سَاوٰى بَيۡنَ الصَّدَفَيۡنِ قَالَ انۡفُخُوۡا ﴾ (18/الکہف:96) ''یہاں تک کہ جب اس نے برابر کر دیا پہاڑوں کے دونوں کناروں کے درمیان کو، تو اس نے کہا تم لوگ پھونکو۔''

(افتعال) اِسۡتِوَاءٌ: (1) استویٰ کے بعد اگر دو ''فاعل'' آئیں (یعنی اگر معطوف علیہ اور معطوف مل کر فاعل ہو) تو اس کے معنی ہوتے ہیں دونوں میں برابری کرنا۔ ﴿ قُلۡ هَلۡ يَسۡتَوِي الۡاَعۡمٰى وَ الۡبَصِيۡرُ ۙ اَمۡ هَلۡ تَسۡتَوِي الظُّلُمٰتُ وَ النُّوۡرُ ﴾ (13/الرعد:16) ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم کہیے کیا برابر ہوتے ہیں اندھا اور بصیرت والا یا کیا برابر ہوتے ہیں اندھیرے اور نور۔''

(2) اگر دو فاعل نہ ہوں، یعنی ایک ہی فاعل ہو، تو پھر اس کے معنی سنبھلنے، درست ہونے اور سیدھا ہونے کے ہوتے ہیں

جیسے فرمایا: ﴿ذُوْ مِرَّةٍ ؕ فَاسْتَوٰی ۙ﴿۶﴾ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰی ؕ﴿۷﴾﴾ (53/النجم:6،7) ''زور آور نے، پھر سیدھا بیٹھا اور وہ تھا اونچے کنارہ پر آسمان کے۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) یا فرمایا: ﴿وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰۤی﴾ (28/القصص:14) ''اور جب پہنچ گیا اپنے زور پر اور سنبھل گیا۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)

(3) اِسْتَوٰی اِلٰی۔ارادہ کرنا۔متوجہ ہونا۔قصد کرنا۔ ﴿ثُمَّ اسْتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ وَ هِیَ دُخَانٌ﴾ (41/حٰمٓ السجدۃ:11) ''پھر وہ متوجہ ہوا آسمان کی طرف اس حال میں کہ وہ دھواں تھا۔''

(4) اِسْتَوٰی عَلٰی۔غالب آنا۔قرار پکڑنا۔قائم ہونا۔جم کر بیٹھنا۔ ﴿الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ۛؕ﴾ (25/الفرقان:59) ''جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، چھ دنوں میں پھر وہ قائم ہوا عرش پر۔'' جب اللہ تعالیٰ کے لیے استویٰ علیٰ استعمال ہو تو مطلب ہوتا ہے کہ تخت حکومت پر اس طرح قابض ہونا کہ اس کا کوئی حصہ اور گوشہ اقتدار سے باہر نہ رہے اور قبضہ اور تسلط میں کسی قسم کی مزاحمت اور گڑبڑی نہ پائی جائے۔سب کام اور انتظام برابر ہو۔ (تلخیص از تفسیر عثمانی، ص ۲۰۹)۔ ﴿وَ اسْتَوَتْ عَلَی الْجُوْدِیِّ﴾ (11/ھود:44) ''اور قرار پکڑا اُس کشتی نے جودی پہاڑ پر یعنی وہ کشتی جودی پہاڑ پر ٹھہر گئی۔'' 'جم کر بیٹھنے' کے معنوں میں یہ آیت ہے۔ ﴿لِتَسْتَوٗا عَلٰی ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَیْتُمْ عَلَیْهِ﴾ (43/الزخرف:13) ''تاکہ تم اُن کی پیٹھ پر جم کر بیٹھو پھر جب تم اُس پر جم کر بیٹھ چکو تو اپنے پروردگار کی اِس نعمت کو یاد کرو۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)

ن ذ ر

(ض۔ن) نَذْرًا کسی حادثے کی وجہ سے کسی غیر واجب چیز کو اپنے اوپر واجب کر لینا۔منت ماننا (امام راغبؒ)۔ ﴿اِنِّیْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا﴾ (19/مریم:26) ''میں نے منت مانی رحمٰن کے لئے ایک روزے کی۔''

نَذْرٌ ج: نُذُوْرٌ- اسم ذات ہے۔منت۔نذر۔ ''نذر یہ ہے کہ آدمی اپنی کسی مراد کے برآنے پر کسی ایسے خرچ یا کسی ایسی خدمت کو اپنے اُوپر لازم کر لے، جو اس کے ذمے فرض نہ ہو۔اگر یہ مراد کسی حلال و جائز امر کی ہو، اور اللہ سے مانگی گئی ہو، اور اس کے برآنے پر جو عمل کرنے کا عہد آدمی نے کیا ہے، وہ اللہ ہی کے لیے ہو تو ایسی نذر اللہ کی اطاعت میں ہے اور اس کا پورا کرنا اجر و ثواب کا موجب ہے۔اگر یہ صورت نہ ہو تو ایسی نذر کا ماننا معصیت اور اس کا پورا کرنا موجب عذاب ہے۔'' (تفہیم القرآن، ج ۱، ص ۲۰۸) ﴿وَ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُهٗ ؕ﴾ (2/البقرہ:270) ''اور جو تم لوگ انفاق کرو کسی خرچے میں سے یا جو تم لوگ منت مانو کسی منت میں سے تو یقیناً اللہ اس کو جانتا ہے۔'' ﴿ثُمَّ لْیَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَ لْیُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَ لْیَطَّوَّفُوْا بِالْبَیْتِ الْعَتِیْقِ﴿۲۹﴾﴾ (22/الحج:29) ''پھر ان لوگوں کو چاہیے کہ اتاریں اپنے میل کچیل اور پوری کریں اپنی نذریں اور طواف کریں قدیم گھر کا یعنی خانہ کعبہ کا۔''

(س) نَذْرًا کسی متوقع خطرہ سے خبردار ہونا۔چوکنا ہونا۔باب سمع سے فعل قرآن مجید میں استعمال نہیں ہوا۔

(افعال) اِنْذَارًا، نُذُرًا، نُذْرًا کسی متوقع خطرے سے خبردار کرنا۔وارننگ دینا۔ ''ایسی خبر دینا جس سے خوف پیدا ہو۔اردو میں اس کا ترجمہ ڈرانے سے کیا جاتا ہے لیکن مطلقاً ڈرانے کو انذار نہیں کہتے۔بلکہ ایسا ڈرانا جو شفقت اور رحمت کی بناء پر ہو۔جیسے والدین اولاد کو

آگ سے، سانپ وغیرہ سے ڈراتے ہیں۔ اس میں شفقت اور ہمدردی کا پہلو ہوتا ہے۔ جبکہ ڈاکو اور چور جو انسانوں کو ڈراتے ہیں اس میں شفقت کا پہلو نہیں ہوتا اس لیے ان کے ڈرانے کو انذار اور ان لوگوں کو نذیر نہیں کہا جاتا۔ جبکہ انبیاء کو خصوصیت کے ساتھ نذیر کا لقب دیا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ آئندہ آنے والے مصائب سے از راہِ شفقت لوگوں کو ڈراتے ہیں۔'' (معارف القرآن)۔ پیر کرم شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: ''نَذَرَ کے مادہ کا اطلاق اس ڈرانے پر ہوتا ہے جس میں کم از کم دو خصوصیتیں ہوں۔ ایک تو وہ ڈرانا بروقت ہو۔ یوں نہیں کہ جب پتھر آسمان سے برسنے شروع ہو جائیں تو خطرہ کا الارم بجنے لگے۔ دوسری بات یہ ہے کہ انذار سے مقصد صرف عذاب کی خبر دینا نہیں ہوتا بلکہ اصل مقصد اس شخص کی خیر خواہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے بچاؤ کا انتظام کر لے۔ لسان العرب میں ہے کہ عرب کہتے ہیں: اَنْذَرْتُ الْقَوْمَ مَسِيْرَ الْعَدُوِّ اِلَيْهِمْ فَنَذَرُوْا اَىْ عَلَّمْتُهُمْ ذٰلِكَ فَعَلِمُوْا وَ تَحَرَّزُوْا یعنی میں نے قوم کو دشمن کے حملے سے خبردار کیا۔ پس اُنہوں نے اپنا بچاؤ کر لیا۔'' (ضیاء القرآن، ج۴،ص۳۳۵)۔ ﴿وَ اُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَ مَنْۢ بَلَغَ ؕ﴾ (6/الانعام:19) ''اور وحی کیا گیا میری طرف یہ قرآن تا کہ میں خبردار کروں تم لوگوں کو اس کے ذریعہ سے اور اس کو جس کو وہ پہنچے۔''

اَنْذِرْ ج: اَنْذِرُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو خبردار کر۔ ﴿وَ اَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ﴾ (14/ابراہیم:44) ''اور خبردار کیجئے لوگوں کو اس دن سے جب آئے گا ان کے پاس عذاب۔''

مُنْذِرٌ ج: مُنْذِرُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ خبردار کرنے والا۔ ڈرانے والا۔ صاحبؒ لغات القرآن فرماتے ہیں: ''ہر پیغمبر عذابِ الٰہی سے سرکشوں اور نافرمانوں کو ڈراتا ہے اس لیے ہر پیغمبر کو منذر کہا جاتا ہے اور چونکہ ہر پیغمبر کے ڈرانے کا اصل مقصد ہدایت کرنا ہوتا ہے اس لیے بعض ترجمہ کرنے والوں نے منذر کا ترجمہ ہادی بھی کیا ہے۔'' (لغات القرآن، ج۵، ص:۴۵۲) ﴿اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۠﴾ (13/الرعد:7) ''کچھ نہیں سوائے اس کے کہ آپ ﷺ ایک خبردار کرنے والے ہیں اور ہر ایک قوم کیلئے ایک ہدایت دینے والا ہے۔''

مُنْذَرٌ اسم المفعول ہے۔ جس کو خبردار کیا گیا۔ جو ڈرایا گیا یعنی جس کو سرکشی اور نافرمانی کی سزا سے ڈرایا گیا۔ ﴿وَ اَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ﴾ (10/یونس:73) ''اور ہم نے ڈبویا ان لوگوں کو جنہوں نے جھٹلایا ہماری نشانیوں کو، تو دیکھ کیسا تھا خبردار کئے جانے والوں کا انجام۔''

نَذِيْرٌ ج: نُذُرٌ۔ فَعِيْلٌ کا وزن ہے اسم الفاعل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اس کے معنی خبردار ہونے والا کے بجائے خبردار کرنے والا، ڈرانے والا ہیں۔ نوٹ: صاحبؒ لغات القرآن فرماتے ہیں: ''یاد رکھو کہ قرآن مجید میں ہر جگہ نذیر یعنی ڈرانے والے سے مراد ہے نافرمانوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرانے والا'' (لغات القرآن، ج:۶، ص:۴۰) ﴿وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا﴾ (34/سبا:28) ''اور ہم نے نہیں بھیجا آپ ﷺ کو مگر تمام انسانوں کے لئے خوشخبری دینے والا اور خبردار کرنے والا ہوتے ہوئے۔'' ﴿وَ قَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖۤ﴾ (46/الاحقاف:21) ''اور گزر چکے ہیں خبردار کرنے والے ان کے سامنے اور ان کے پیچھے۔''

اَمْ حرف عطف ہے اس کی دو قسمیں ہیں: (۱) متصل (۲) منقطع۔

(۱) متصل: وہ ہے جس سے پہلے ہمزۂ تسویہ (سَوَآءٌ کا ہمزہ) آئے جیسے سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ۔ ایسی صورت میں 'اَ' کے معنی 'خواہ' یا 'چاہے' کے ہوتے ہیں۔ اور اَمْ کے معنی 'یا' کے ہوتے ہیں۔ کسی جملہ میں ءَ کے بعد اگر اَمْ لانا ہو تو، زیادہ تر ءَ کے بعد فعل ماضی لاتے ہیں اور اَمْ کے بعد فعل مضارع لاتے ہیں۔ پھر مضارع میں ماضی کا مفہوم پیدا کرنے کے لئے اس پر لَمْ داخل کرتے ہیں۔ یا اس سے پہلے ایسا ہمزہ استفہام آتا ہے جس کو اَمْ کے ساتھ ملانے سے کسی چیز کا تعین مقصود ہو۔ جیسے أَزَيْدٌ عِنْدَكَ اَمْ عُمَرُ۔ ایسی صورت میں اَمْ کے معنی اَوْ (یا) کے ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے اسے متصل کہتے ہیں کیونکہ اِس سے ماقبل اور مابعد آپس میں ملے ہوتے ہیں۔

(۲) منقطع: یعنی وہ جو متصل کے خلاف ہو۔ اس صورت میں اَمْ کے وہ معنی جو اِس سے کبھی جدا نہیں ہوتے 'اِضْرَابٌ' ہے یعنی پہلی بات سے اعراض کرنا تبھی یہ منقطع کہلاتا ہے۔ ایسے اَمْ کے کئی معنی ہوتے ہیں مثلاً، یا، خواہ، کیا، بَلْ (بلکہ)۔ بَلْ اور ہمزہ (بَلْ اَ) استفہام کے لیے آتا ہے۔ عموماً اِس سے پہلے کوئی سوال ہوتا ہے۔ جس کو چھوڑ کر اَمْ (بمعنی بَلْ اَ) سے کوئی دوسرا سوال پوچھا جاتا ہے مثلاً ﴿ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ ﴾ یا ﴿ اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ۝ ﴾۔ اَمْ بعض دفعہ زائدہ بھی آتا ہے۔

يُؤْمِنُوْنَ (ء م ن): البقرۃ آیت 3 دیکھیں۔

ترکیب اِنَّ حرف مشبہ بالفعل۔ الَّذِيْنَ، اسم موصول اور كَفَرُوْا، اس کا صلہ۔ صلہ اور موصول مل کر اسم ہوئے اِنَّ کے۔ آگے جملہ اسمیہ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ تک خبر اوّل ہے اِنَّ کی۔ اس میں سَوَآءٌ مبتدا ہے اور عَلَيْهِمْ جار مجرور متعلق ہیں سَوَآءٌ سے۔ اَ۔ ہمزہ تسویہ ہے۔ اَنْذَرْتَ فعل اور اِس میں شامل ضمیر اُس کا فاعل اور هُمْ اس کا مفعول بِہ۔ اَمْ حرف عطف ہے اور جملہ لَمْ تُنْذِرْهُمْ عطف ہے اَنْذَرْتَهُمْ پر اور جملہ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ، سَوَآءٌ کی خبر ہے اور محلاً حالت رفع میں ہے۔ آگے جملہ فعلیہ لَا يُؤْمِنُوْنَ خبر ثانی ہے اِنَّ کی۔ اس میں لَا نفی کا ہے۔ اس آیت کی اور تراکیب بھی کی گئی ہیں۔

ترجمہ
البقرۃ:6

اِنَّ	الَّذِيْنَ كَفَرُوْا	سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ	ءَاَنْذَرْتَهُمْ
یقیناً	جن لوگوں نے انکار کیا	برابر ہے ان پر	خواہ آپؐ خبردار کریں ان کو

اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ	لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝
یا آپؐ خبردار نہ کریں ان کو	وہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے

نوٹ:1 **کفر:** حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ ''کفر'' کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''کفر کے لفظی معنی چھپانے کے ہیں، ناشکری کو بھی کفر اس لیے کہتے ہیں کہ محسن کے احسان کو چھپانا ہے (مطلب انسان اپنے محسن کے احسان کو چھپاتا ہے)۔ اصطلاح شریعت میں جن چیزوں پر ایمان لانا فرض ہے ان میں سے کسی چیز کے انکار کا نام کفر ہے، مثلاً ایمان کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول کریم ﷺ جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے ہیں اور اس کا ثبوت قطعی و یقینی ہے اُن سب چیزوں کی دل سے تصدیق کرنا، اور حق سمجھنا، اس لیے جو شخص رسول کریم ﷺ کی اُن تعلیمات میں سے جن کا ثبوت یقینی اور قطعی ہے کسی ایک کو بھی حق نہ سمجھے اور اس کی تصدیق نہ کرے وہ کافر کہلائے گا۔'' (معارف القرآن، ج ۱، ص ۱۱۷)۔

حضرت مولانا مودودیؒ نے ''کفر'' کی وضاحت نہایت خوبصورت انداز میں کی ہے، فرماتے ہیں: ''کفر کے اصلی معنی چھپانے کے ہیں۔ اسی سے انکار کا مفہوم پیدا ہوا اور یہ لفظ ایمان کے مقابلے میں بولا جانے لگا۔ ایمان کے معنی ہیں ماننا، قبول کرنا، تسلیم کر لینا۔ اس کے برعکس کفر کے معنی ہیں نہ ماننا، رد کر دینا، انکار کرنا۔ قرآن کی رُو سے کفر کے رویہ کی مختلف صورتیں ہیں:

ایک یہ کہ انسان سرے سے خدا ہی کو نہ مانے، یا اُس کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم نہ کرے اور اس کو اپنا اور ساری کائنات کا مالک اور معبود ماننے سے انکار کر دے، یا اسے واحد مالک اور معبود نہ مانے۔

دوسرے یہ کہ اللہ کو تو مانے مگر اُس کے احکام اور اُس کی ہدایات کو واحد منبع علم و قانون تسلیم کرنے سے انکار کردے۔

تیسرے یہ کہ اُصولاً اس بات کو بھی تسلیم کرلے کہ اسے اللہ ہی کی ہدایت پر چلنا چاہیے، مگر اللہ اپنی ہدایات اور اپنے احکام پہنچانے کے لیے جن پیغمبروں کو واسطہ بناتا ہے، انہیں تسلیم نہ کرے۔

چوتھے یہ کہ پیغمبروں کے درمیان تفریق کرے اور اپنی پسند یا اپنے تعصّبات کی بنا پر ان میں سے کسی کو مانے اور کسی کو نہ مانے۔

پانچویں یہ کہ پیغمبروں نے خدا کی طرف سے عقائد، اخلاق اور قوانینِ حیات کے متعلق جو تعلیمات بیان کی ہیں اُن کو یا اُن میں سے کسی چیز کو قبول نہ کرے۔

چھٹے یہ کہ نظریے کے طور پر تو ان سب چیزوں کو مان لے مگر عملاً احکامِ الٰہی کی دانستہ نافرمانی کرے اور اس نافرمانی پر اصرار کرتا رہے، اور دنیوی زندگی میں اپنے رویے کی بنا اطاعت پر نہیں بلکہ نافرمانی ہی پر رکھے۔

یہ سب مختلف طرزِ فکر و عمل اللہ کے مقابلے میں باغیانہ ہیں اور ان میں سے ہر ایک رویے کو قرآن کفر سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کے علاوہ بعض مقامات پر قرآن میں کفر کا لفظ کفرانِ نعمت کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے اور شکر کے مقابلے میں بولا گیا ہے۔ شکر کے معنی یہ ہیں کہ نعمت جس نے دی ہے انسان اس کا احسان مند ہو، اس کے احسان کی قدر کرے، اس کی دی ہوئی نعمت کو اسی کی رضا کے مطابق استعمال کرے، اور اُس کا دل اپنے محسن کے لیے وفاداری کے جذبے سے لبریز ہو۔ اس کے مقابلے میں کفر یا کفرانِ نعمت یہ ہے کہ آدمی یا تو اپنے محسن کا احسان ہی نہ مانے اور اسے اپنی قابلیت یا کسی غیر کی عنایت یا سفارش کا نتیجہ سمجھے، یا اُس کی دی ہوئی نعمت کی ناقدری کرے اور اسے ضائع کردے، یا اُس کی نعمت کو اس کی رضا کے خلاف استعمال کرے، یا اس کے احسانات کے باوجود اس کے ساتھ غدر اور بے وفائی کرے۔ اس نوع کے کفر کو ہماری زبان میں بالعموم احسان فراموشی، نمک حرامی، غداری اور ناشکرے پن کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ (تفہیم القرآن، ج۱، ص۱۲۹)

آیت:7

﴿ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۡ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ ﴾

خ ت م

(ض) خَتْمًا (1) مہر لگانا تاکہ اندر کی چیز باہر اور باہر کی چیز اندر نہ جا سکے یعنی محفوظ کرلینا، بند کر دینا۔ اس کے ساتھ عَلٰی کا صلہ استعمال ہوتا ہے۔ ﴿ اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ ﴾ (36/یٰسین:65) ''اس دن ہم مہر لگا دیں گے ان کے مونہوں پر۔''

(2) کسی کام سے فارغ ہونا، ختم کرنا۔

(3) کسی چیز کے آخر تک پہنچ جانا۔ اسی معنی میں ختم قرآن بولتے ہیں یعنی قرآن کو آخر تک پڑھ لینا۔

حضرت مولانا مودودیؒ ''ختم'' کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''عربی لغت میں محاورے کی رو سے ''ختم'' کے معنی مہر لگانے، بند کرنے، آخر تک پہنچ جانے اور کسی کام کو پورا کر کے فارغ ہو جانے کے ہیں۔ خَتَمَ الْعَمَلَ کے معنی میں فَرَغَ مِنَ الْعَمَلِ، ''کام سے فارغ ہو گیا۔'' خَتَمَ الْاِنَاءَ کے معنی ہیں ''برتن کا منہ بند کر دیا اور اس پر مہر لگا دی تاکہ نہ کوئی چیز اس میں سے نکلے اور نہ کچھ اس کے اندر داخل ہو۔'' خَتَمَ الْكِتَابَ کے معنی ہیں ''خط بند کر کے اس پر مہر لگا دی تاکہ خط محفوظ ہو جائے۔'' خَتَمَ عَلَى الْقَلْبِ ''دل پر مہر لگا دی کہ نہ کوئی بات اس کی سمجھ میں آئے، نہ پہلے سے جمی ہوئی کوئی بات اس میں سے نکل سکے۔'' خِتَامُ كُلِّ مَشْرُوْبٍ ''وہ مزا جو کسی چیز کو پینے کے بعد آخر میں محسوس ہوتا ہے۔'' خَاتِمَةُ كُلِّ شَيْءٍ، عَاقِبَتُهٗ وَاٰخِرَتُهٗ، ''ہر چیز کے خاتمہ سے مراد ہے اس کی عاقبت اور آخرت۔'' خَتَمَ الشَّيْءَ،

بَلَغَ اٰخِرَہٗ ''کسی چیز کو ختم کرنے کا مطلب ہے اس کے آخر تک پہنچ جانا۔'' اسی معنی میں ختم قرآن بولتے ہیں اور اسی معنی میں سورتوں کی آخری آیات کو خواتیم کہا جاتا ہے۔ خَاتَمُ الْقَوْمِ، اٰخِرُھُمْ ''خاتم القوم سے مراد ہے قبیلے کا آخری آدمی۔'' (ملاحظہ ہو لسان العرب، قاموس اور اقرب الموارد) (تفہیم القرآن، ج ۴، ص ۱۳۹)

خِتَامٌ اسم ذات ہے۔ وہ چیز جس سے مہر لگائی جائے جیسے لاکھ، گیلا آٹا، گیلی مٹی وغیرہ۔ ﴿ يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ۙ﴿۲۵﴾ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ۭ وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ﴿۲۶﴾ ﴾ (83/المطففین: 25-26) ''ان کو پلائی جائے گی خالص شراب مہر لگی ہوئی۔ اس کی مہر مشک ہے اور چاہیے کہ اس میں جان کھپائیں جان کھپانے والے۔''

خَاتَمٌ اس کے تین معنی ہیں (۱) مہر (۲) ختم کرنے والا (۳) آخری۔ ﴿ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ۭ ﴾ (33/الاحزاب: 40) ''اور نہیں ہیں محمد ﷺ کسی ایک کے باپ تمہارے مردوں میں سے، اور لیکن اللہ کے رسول ہیں اور نبیوں کے سلسلہ کو ختم کرنے والے ہیں۔'' اس آیت میں خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ کے عام طور پر تین طرح سے ترجمے کیے گئے ہیں مثلاً (۱) حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں: ''اور مہر سب نبیوں پر۔'' یعنی آپ ﷺ کی تشریف آوری سے نبیوں کے سلسلے پر مہر لگ گئی۔ اب کسی کو نبوت نہیں دی جائے گی۔ بس جس کو ملنی تھی مل چکی۔ یا دوسرے لفظوں میں حضور ﷺ کی تشریف آوری کے بعد انبیاء کی آمد کا سلسلہ بند ہو گیا اور اس پر مہر لگا دی گئی تا کہ کوئی کذّاب، دجّال اس میں داخل نہ ہو سکے۔ (۲) تفسیر احسن البیان میں اس کا ترجمہ ''تمام نبیوں کے ختم کرنے والے'' سے کیا گیا ہے۔ یعنی انبیاء کے سلسلے کو ختم کرنے والے۔ (۳) حضرت مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ فرماتے ہیں: ''اور (سب) نبیوں کے ختم پر ہیں'' خَاتَمٌ اور خَاتِمٌ، دونوں کے معنی لغت میں آخر کے ہیں۔ قوم کے آخری فرد کو خِتَام، خَاتَم اور خَاتِمْ کہا جاتا ہے۔ کسی چیز کے آخر کو خاتمۃ الشئ کہتے ہیں۔ اسی مناسبت سے حضور ﷺ کو خاتم النبیین کہا جاتا ہے۔ کہ وہ تمام نبیوں سے آخر میں تشریف لائے۔ (واللہ اعلم)

مَخْتُوْمٌ اسم المفعول ہے۔ جس پر مہر لگا دی جائے۔ مہر لگا ہوا۔ ﴿ يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ۙ﴿۲۵﴾ ﴾ (83/المطففین: 25) ''اُن کو پلائی جائے گی خالص شراب مہر لگی ہوئی۔''

ق	ل	ب

(ض) **قَلْبًا** کسی چیز کو ایک حالت یا رخ سے دوسری طرف پھیرنا، پلٹنا یا موڑنا۔ ﴿ وَاِلَيْهِ تُقْلَبُوْنَ ﴿۲۱﴾ ﴾ (29/العنکبوت: 21) ''اور اس کی طرف ہی تم لوگ پلٹائے جاؤ گے۔'' عربی زبان میں قَلْبُ الْاَمْرِ کا مطلب ہوتا ہے کسی معاملے کو الٹ پلٹ کر دیکھنا اور جانچنا کہ اس کا ہر پہلو صاف ظاہر ہو جائے۔

قَلْبٌ ج: قُلُوْبٌ۔ اسم ذات ہے۔ دل (کیونکہ یہ ہر لمحہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پلٹتا رہتا ہے۔) مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ فرماتے ہیں: ''دل سے مراد سینہ کے اندر کا وہ مضغۂ گوشت نہیں جو طبی اصطلاح میں دل کہلاتا ہے۔ بلکہ وہ دل مراد ہے جو محاورۂ زبان میں احساس، عقل، ارادہ سب کا مرکز ہے۔ انسانی بول چال میں دل اسی کو کہا جاتا ہے اور افعال ارادی کا صدور اسی سے ہوتا ہے۔ توریت، انجیل اور دوسرے صحیفے سب میں یہی محاورہ استعمال کیا گیا ہے۔'' ﴿ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ۭ ﴾ (64/التغابن: 11) ''اور جو ایمان لاتا ہے اللہ پر تو وہ ہدایت دیتا ہے اس کے دل کو۔'' ﴿ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ﴾ (7/الاعراف: 179) ''ان کے دل ہیں (لیکن) وہ لوگ سمجھتے نہیں ان سے۔''

(تفعیل) تَقْلِیْبًا کسی چیز کو بار بار پلٹنا (اس میں مبالغے کا مطلب ہوتا ہے)۔﴿وَ نُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَ ذَاتَ الشِّمَالِ﴾ (18/الکہف:18)''اور ہم بار بار پلٹتے ہیں ان کو دائیں جانب اور بائیں جانب یعنی ہم ان کی کروٹیں بدلتے رہتے ہیں۔''

(تفعّل) تَقَلُّبًا کسی چیز کا خود بار بار پلٹنا، گھومنا پھرنا۔﴿قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ﴾ (2/البقرہ:144)''ہم نے دیکھ لیا ہے آپ ﷺ کے چہرے کا بار بار پلٹنا آسمان میں۔''﴿لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ﴾ (3/آل عمران:196)''ہرگز دھوکا نہ دے آپ ﷺ کو شہروں میں ان لوگوں کا گھومنا پھرنا جنہوں نے کفر کیا۔''

مُتَقَلَّبٌ اسم المفعول ہے جو بطور اسم ظرف استعمال ہوتا ہے۔ گھومنے پھرنے کی جگہ۔﴿وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَ مَثْوٰىكُمْ﴾ (47/محمد:19)''اللہ جانتا ہے تمہارے گھومنے پھرنے کی جگہ کو اور تمہارے واپس ہونے کی جگہ کو۔''

(انفعال) اِنْقِلَابًا کسی چیز کا خود ایک حالت یا رخ سے دوسری طرف پھرنا یا پلٹنا۔﴿اَفَاْئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ﴾ (3/آل عمران:144)''تو کیا اگر وہ یعنی حضور ﷺ انتقال کر جائیں یا قتل کئے جائیں تو تم لوگ الٹے پھر جاؤ گے اپنی ایڑیوں کے بل۔''

مُنْقَلِبٌ ج: مُنْقَلِبُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ پھرنے والا۔ پلٹنے والا۔﴿قَالُوْۤا اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ﴾ (7/الاعراف:125) ''ان لوگوں نے کہا بیشک ہم اپنے رب کی طرف پلٹنے والے ہیں۔''

مُنْقَلَبٌ اسم المفعول ہے جو بطور اسم ظرف استعمال ہوتا ہے پلٹنے کی جگہ۔﴿وَ سَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ﴾ (26/الشعراء:227)''اور جان لیں گے وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا کہ کون سی پلٹنے کی جگہ وہ لوگ پلٹیں گے۔''

س م ع

(س) سَمَاعًا ، سَمْعًا سننا۔ کسی بات کو سن کر سمجھنا۔﴿رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ﴾ (3/آل عمران:193)''اے ہمارے رب بیشک ہم نے سنا ایک ندا دینے والے کو کہ وہ ندا دیتا ہے ایمان کیلئے۔''

نوٹ: سَمْعٌ مصدر بھی ہے اور اسم بھی۔ بطور مصدر استعمال ہو تو مطلب ہوتا ہے سننا۔ بطور اسم یہ لفظ ''سننے کی قوت'' اور ''کان'' دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ سَمْعٌ بمعنی کان، واحد اور جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

اِسْمَعْ ج: اِسْمَعُوْا۔ فعل امر ہے۔ توسن۔﴿خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اسْمَعُوْا﴾ (2/البقرہ:93)''تم لوگ پکڑو جو ہم نے دیا تم لوگوں کو مضبوطی سے اور تم لوگ سنو۔''

سَمِيْعٌ فَعِيْلٌ کا وزن ہے اسم الفاعل کے معنی میں۔ سننے والا۔﴿اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ﴾ (2/البقرہ:127)''یقیناً تو ہی سننے والا جاننے والا ہے۔''

سَمَّاعٌ فَعَّالٌ کے وزن پر اسم المبالغہ ہے۔ بہت زیادہ سننے والا۔ کان دھرنے والا۔ خوب کان لگا کر سننا کبھی تو جاسوسی کے لیے ہوتا ہے، اور کبھی قبول کرنے اور ماننے کے لیے، چنانچہ سَمَّاعٌ کا استعمال جاسوس اور مطیع (ماننے والا) دونوں کے لیے ہوتا ہے۔﴿سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ﴾ (5/المائدۃ:41)''جاسوسی کرتے ہیں جھوٹ بولنے کے لیے، وہ جاسوس ہیں دوسری جماعت کے۔'' حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اس آیت میں سَمّٰعُوْنَ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''سَمّٰعُوْنَ کے معنی ہیں بہت زیادہ سننے والے اور کان دھرنے والے، پھر ''بہت زیادہ سننا'' کبھی تو

جاسوسی پر اطلاق کیا جاتا ہے اور کبھی اس کے معنی ہوتے ہیں ''بہت زیادہ قبول کرنے والا'' جیسے ''سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ'' میں سننے کے معنی قبول کرنے کے ہیں۔ مترجم رحمہ اللہ نے یہاں پہلے معنی مراد لیے ہیں۔ لیکن ابن جریرؒ وغیرہ محققین نے دوسرے معنی پر حمل کیا ہے۔ ''سمّاعون للکذب'' یعنی جھوٹ اور باطل کو بہت زیادہ ماننے اور قبول کرنے والے سمّاعون لقوم اٰخرین یعنی دوسری جماعت جس نے ان کو بھیجا اور خود تمہارے پاس نہیں آئی ان کی بات بہت زیادہ ماننے والے۔'' (تفسیر عثمانیؒ، ص ۱۵۱)

(افعال) اِسْمَاعًا کسی کو سنانا۔ ﴿فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ﴾ (30/الروم:52) ''یقیناً آپ ﷺ نہیں سناتے مردوں کو اور آپ ﷺ نہیں سناتے بہروں کو پکار۔''

مُسْمِعٌ اسم الفاعل ہے۔ سنانے والا۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴿٢٢﴾﴾ (35/فاطر:22) ''بیشک اللہ سناتا ہے اسکو جس کو وہ چاہتا ہے۔ اور آپ ﷺ سنانے والے نہیں ہیں ان کو جو قبروں میں ہیں۔''

مُسْمَعٌ اسم المفعول ہے۔ جس کو سنایا جائے۔ ﴿وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ﴾ (4/النساء:46) ''اور سنو اور تمہیں سنوایا نہ جائے۔''

نوٹ: اِسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ: یہ محاورہ دو طرح سے بولا جاتا ہے (۱) بطور بددعا۔ یعنی تم سنو اور بہرے ہو جاؤ اور کچھ نہ سن سکو۔ (۲) بطور دعا۔ یعنی سنو اور تمہیں کوئی بری بات نہ سننی پڑے اور تو ہمیشہ غالب اور معزّز رہے۔

(تفعّل) تَسَمُّعًا سننے کی کوشش کرنا۔ کان لگانا۔ ﴿لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى﴾ (37/الصافات:8) ''وہ لوگ کان نہیں لگا سکتے عالم بالا کی طرف۔'' (یَسَّمَّعُوْنَ، اصل میں یَتَسَمَّعُوْنَ تھا۔ 'ت'، 'س' سے بدل گئی اور پھر دونوں 'س' کا ادغام ہو گیا۔ یاد رہے کہ اس خصوصی قاعدے کا تعلق باب تفعّل اور تفاعل سے ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ اگر باب تفعّل اور تفاعل کے 'ف' کلمہ پر اگر مندرجہ ذیل دس حروف میں سے کوئی حرف آ جائے تو ان ابواب کی 'ت' تبدیل ہو کر وہی حرف بن جاتی ہے جو 'ف' کلمہ پر آیا ہو۔ اس کے بعد اِن پر ادغام کے قواعد کا اطلاق ہوتا ہے۔ وہ دس حروف یہ ہیں: ''ث، د، ذ، ز، س، ش، ص، ض، ط، ظ۔'' (اس قاعدے کی تفصیل کے لیے ''آسان عربی گرامر'' از لطف الرحمٰن خان صاحب، حصہ سوم، صفحہ ۶۴ دیکھیں)۔

(افتعال) اِسْتِمَاعًا دھیان سے سننا۔ غور سے سننا۔ ﴿الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ؕ﴾ (39/الزمر:18) ''جو لوگ دھیان سے سنتے ہیں بات کو پھر پیروی کرتے ہیں اس کی اچھی طرح۔''

اِسْتَمِعْ ج: اِسْتَمِعُوْا۔ فعل امر ہے۔ دھیان سے سنو۔ ﴿وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا﴾ (7/الاعراف:204) ''اور جب قرآن پڑھا جائے تو دھیان سے سنو اس کو اور خاموش رہو۔''

مُسْتَمِعٌ ج: مُسْتَمِعُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ دھیان سے سننے والا۔ ﴿فَاذْهَبَا بِاٰيٰتِنَآ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ﴿١٥﴾﴾ (26/الشعراء:15) ''پس تم دونوں جاؤ ہماری نشانیوں کے ساتھ۔ بیشک ہم تمہارے ساتھ ہیں پوری طرح سننے والے ہیں۔''

ب	ص	ر

(ک) بَصَارَةً دیکھنا۔ دیکھ کر سمجھنا اور جاننا۔ ﴿بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ﴾ (20/طٰہٰ:96) ''میں نے دیکھ کر سمجھا اسے جو وہ لوگ نہیں سمجھے۔''

بَصَرٌ ج: اَبۡصَارٌ- اسم ذات ہے۔(۱) آنکھ۔(۲) دیکھنے کی قوت (بینائی) بینائی دل کی ہو یا آنکھ کی دونوں کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔(۳) دیکھ کر سمجھنے کی حِس۔﴿ اَفَرَءَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـہَہٗ ہَوٰىہُ وَ اَضَلَّہُ اللّٰہُ عَلٰی عِلۡمٍ وَّ خَتَمَ عَلٰی سَمۡعِہٖ وَ قَلۡبِہٖ وَ جَعَلَ عَلٰی بَصَرِہٖ غِشٰوَۃً ؕ﴾(45/الجاثیۃ:23)''تو کیا آپ ﷺ نے دیکھا اس کو جس نے بنایا معبود اپنی خواہش کو اور گمراہ کیا اسکو اللہ نے علم کے باوجود اور اس نے مہر لگادی اس کی سماعت پر اور اس کے دل پر اور اس نے بنایا اس کی بصارت پر ایک پردہ۔''

بَصِیۡرَۃٌ ج: بَصَائِرُ۔ اس کا لفظی مطلب ہے بینائی لیکن یہ صرف دل کی بینائی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔یعنی دل کی وہ روشنی یا نور جس سے انسان چیزوں کی حقیقت سے آگاہ ہوتا ہے۔ پھر یہ لفظ سمجھنے کی صلاحیت، نشان عبرت، سمجھ میں آنے والی دلیل اور حجت کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔﴿ ہٰذِہٖ سَبِیۡلِیۡۤ اَدۡعُوۡۤا اِلَی اللّٰہِ ۟ؔ عَلٰی بَصِیۡرَۃٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِیۡ ؕ﴾ (12/یوسف:108)''یہ میری راہ ہے بلاتا ہوں اللہ کی طرف سمجھ بوجھ کر میں اور جو میرے ساتھ ہے۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ) ﴿ قَدۡ جَآءَکُمۡ بَصَآئِرُ مِنۡ رَّبِّکُمۡ ۚ﴾(6/الانعام:104)''اب تمہارے پاس روشن دلائل تمہارے پروردگار کے پاس سے پہنچ چکے ہیں۔''﴿ بَلِ الۡاِنۡسَانُ عَلٰی نَفۡسِہٖ بَصِیۡرَۃٌ ﴿ۙ۱۴﴾﴾(75/القیامۃ:14)اس آیت کا ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ یہ کرتے ہیں،''بلکہ آدمی اپنے واسطے آپ دلیل ہے۔''اور حضرت مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ اس آیت کا ترجمہ کرتے ہیں:''بلکہ اصل یہ ہے کہ انسان خود ہی اپنی حالت پر خوب مطلع ہوگا۔''اس آیت میں بَصِیۡرَۃٌ سے اکثر بزرگوں نے ''حجت''مراد لی ہے۔

بَصِیۡرٌ فَعِیۡلٌ کا وزن ہے۔اسم الفاعل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔دیکھنے والا۔﴿ وَ اللّٰہُ بَصِیۡرٌۢ بِمَا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹۶﴾﴾ (2/البقرہ:96)اور اللہ دیکھنے والا ہے اس کو جو یہ لوگ کرتے ہیں۔''

(افعال) اِبۡصَارًا دیکھنا اور دکھانا (لازم اور متعدی)۔سمجھ بوجھ رکھنا۔﴿ اَفَسِحۡرٌ ہٰذَاۤ اَمۡ اَنۡتُمۡ لَا تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۱۵﴾﴾(52/الطور:15)''تو کیا یہ بھی سحر ہے یا تمہیں نظر نہیں آتا۔''

اَبۡصِرۡ فعل امر ہے۔تو دیکھ۔﴿ وَّ اَبۡصِرۡہُمۡ فَسَوۡفَ یُبۡصِرُوۡنَ ﴿۱۷۵﴾﴾(37/الصافات:175)''اور آپ ﷺ انہیں دیکھتے رہیے سو عنقریب وہ بھی دیکھ لیں گے۔''

مُبۡصِرٌ ج: مُبۡصِرُوۡنَ۔اسم الفاعل ہے۔دیکھنے والا، دکھانے والے، سمجھانے والا، چیزوں کو واضح کرنے والا۔ جو خود واضح ہو وہ بھی مُبۡصِرٌ ہے اور جو دوسرے کو واضح اور روشن کردے وہ بھی مُبۡصِرٌ ہے۔دن خود بھی روشن ہے اور دوسری چیزوں کو بھی روشن کرنے والا ہے۔﴿ ہُوَ الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الَّیۡلَ لِتَسۡکُنُوۡا فِیۡہِ وَ النَّہَارَ مُبۡصِرًا ؕ﴾(10/یونس:67)''وہ وہی (اللہ) تو ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی کہ تم اس میں چین پاؤ اور دن کو (بنایا) دکھلانے والا''حضرت شیخ الہندؒ نے بھی اس آیت میں ''مُبۡصِرٌ'' کا ترجمہ ''دکھلانے والا'' سے کیا ہے۔

مُبۡصِرَۃٌ ﴿ وَ اٰتَیۡنَا ثَمُوۡدَ النَّاقَۃَ مُبۡصِرَۃً فَظَلَمُوۡا بِہَا ؕ﴾(17/بنی اسرائیل:59)''اور ہم نے دی ثمود کو اونٹنی اُن کے سمجھانے کو پھر ظلم کیا اُس پر۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ)۔''اور ہم نے (قوم) ثمود کو اُونٹنی دی تھی بصیرت کے ذریعے کے طور پر لیکن اُنہوں نے (بڑا) ظلم اُس کے ساتھ کیا۔''(ترجمہ ماجدیؒ)۔''مُبۡصِرَۃٌ کے معنی ایک تو خود روشن چیز کے ہیں اور دوسرے اس چیز کو

بھی کہتے ہیں جس سے دوسری چیزوں پر روشنی پڑے۔'' (تفسیر ماجدیؒ)

(تفعیل) تَبْصِرَةً تَفْعِلَةٌ باب تفعیل کے مصدر کا دوسرا وزن ہے، تَبْصِرَةٌ اسی وزن پر ہے۔ دکھانا اور سمجھانا۔ ﴿وَ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِيْجٍ ۙ تَبْصِرَةً وَّ ذِكْرٰى﴾ (50/قٓ:7-8) ''اور اُگائی اُس نے ہر ہر قسم کی رونق کی چیز سمجھانے کو اور یاد دلانے کو۔''

يُبَصَّرُوْنَ مضارع مجہول کا صیغہ ہے۔ اُنہیں دکھائے جائیں گے۔ ﴿يُّبَصَّرُوْنَهُمْ ؕ﴾ (70/المعارج:11) ''حالانکہ وہ انہیں دکھا بھی دیے جائیں گے۔''

(استفعال) اِسْتِبْصَارًا بصیرت طلب کرنا۔ سوچ بچار کرنا۔

مُسْتَبْصِرٌ ج: مُسْتَبْصِرُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ سوچ بچار کرنے والا۔ ﴿وَ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَ كَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ ۙ﴾ (29/العنکبوت:38) ''اور مزین کیا ان کے لئے شیطان نے ان کے اعمال کو پس اس نے روک دیا ان کو راستہ سے حالانکہ وہ لوگ تھے غور وفکر کرنے والے۔''

نوٹ: دیکھنے کے لیے قرآن مجید میں 'ب ص ر' کے علاوہ 'ر ء ی' اور 'ن ظ ر' کے مادے بھی استعمال ہوئے ہیں۔ تینوں میں کچھ بنیادی فرق ہے۔ 'ر ا ی' کا لفظ دیکھنے کے لیے عام ہے۔ چاہے آنکھوں سے دیکھنا ہو، غور وفکر کے لیے دیکھنا ہو، یا خواب میں دیکھنا ہو۔ 'نَظَرَ' کا لفظ بھی دونوں طرح کے دیکھنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ آنکھوں سے یا غور وفکر کے لحاظ سے۔ لیکن عام طور پر اس کا استعمال آنکھوں سے دیکھنے کے لیے ہوتا ہے۔ اور 'بَصَرَ' کا لفظ اگرچہ ہر طرح کے دیکھنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن عام طور پر دل سے دیکھنے اور سمجھنے بوجھنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں سورۃ الاعراف کی آیت 198 میں تینوں الفاظ ایک ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔ ﴿وَ اِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا ؕ وَ تَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَ هُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ۩﴾ ''اور اگر تم اُنہیں کوئی بات بتلانے کو پکارو تو وہ سن نہ سکیں اور آپ ﷺ اُنہیں دیکھیں گے کہ گویا آپ ﷺ کی طرف نظر کر رہے ہیں درآنحالیکہ اُنہیں کچھ نہیں سوجھ رہا ہے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ اس میں تَرٰی کا لفظ خیال کرنے کے لیے، نَظَرَ کا لفظ آنکھوں سے دیکھنے کے لیے اور بَصَرَ کا لفظ دیکھنے اور سمجھنے کے لیے استعمال ہوا ہے۔ (واللہ اعلم)۔

غ	ش	و

(س) غَشَاوَةً کسی کا کسی پر چھا جانا۔ ڈھانپ لینا۔

غِشَاوَةٌ اسم ذات ہے۔ پردہ۔ ﴿وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۫﴾ (2/البقرہ:7) ''اور ان کی بصارت پر ایک پردہ ہے۔''

غَاشِيَةٌ ج: غَوَاشٍ۔ اسم الفاعل ہے، واحد مؤنث کا صیغہ۔ ڈھانپنے والی، چھا جانے والی۔ ﴿هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ ۘ﴾ (88/الغاشیہ:1) ''کیا پہنچی تجھ کو چھا جانے والی کی خبر۔'' یہ لفظ بطور اسم ذات بھی استعمال ہوتا ہے یعنی اوڑھنے والی چیز، اوڑھنا۔ ﴿لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّ مِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ؕ﴾ (7/الاعراف:41) ''ان کے لیے آتش دوزخ کا بچھونا ہوگا اور ان کے اوپر اسی کا اوڑھنا ہوگا۔''

مَغْشِيٌّ اسم المفعول ہے۔ جس پر ڈھانپا گیا۔ ﴿رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ؕ﴾ (47/محمد:20) ''تو تم نے دیکھا کہ جن کے دلوں میں بیماری تھی وہ تمہاری طرف اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے کسی پر موت چھا گئی ہو۔''

(افعال) اِغْشَاءً ایک چیز کو دوسری چیز سے ڈھانپ دینا۔﴿ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ ﴾(7/الاعراف:54)''وہ ڈھانپ دیتا ہے رات کو دن سے۔''

(تفعیل) تَغْشِيَةً بتدریج کسی پر کسی چیز کو چھا دینا۔ڈھانپ دینا۔﴿ فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى ﴾(53/النجم:54)''پس ان پر چھا گیا جو چھا گیا۔''(ترجمہ ضیاء القرآن)

(تفعّل) تَغَشٍّ بتکلف کسی پر چھا جانا۔ڈھانپ لینا۔﴿ فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا ﴾(7/الاعراف:189)''پھر جب اس نے ڈھانپ لیا اس کو تو اس نے اٹھایا ایک ہلکا حمل۔''

(استفعال) اِسْتِغْشَاءً کسی چیز سے خود کو ڈھانپنا۔﴿ حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ ثِيَابَهُمْ ﴾(11/ھود:5)''جس وقت وہ لوگ خود کو ڈھانپتے ہیں اپنے کپڑوں سے۔''

ترکیب خَتَمَ فعل اور اللہ فاعل ہے۔عَلٰى قُلُوْبِهِمْ پہلا اور عَلٰى سَمْعِهِمْ دوسرا متعلق فعل ہے۔سَمْعٌ مصدر ہے اور مصادر جمع کی صورت میں نہیں لائے جاتے اس لیے سَمْعٌ مفرد لایا گیا ہے جب کہ قُلُوْبٌ اور اَبْصَارٌ جمع ہیں۔عَلٰى اَبْصَارِهِمْ کو اگر خَتَمَ کا تیسرا متعلق فعل مانا جائے تو اگلا لفظ غِشَاوَةٌ بے معنی ہو جاتا ہے۔اس طرح معلوم ہو گیا کہ پہلا جملہ عَلٰى سَمْعِهِمْ پر مکمل ہو گیا ہے۔اسی لیے یہاں وقف مطلق کی علامت ''ط'' بھی ہے جو کہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں ٹھہرنا چاہیے۔وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ سے دوسرا جملہ شروع ہوتا ہے۔اس میں 'وٗ' استئنافیہ ہے۔عَلٰى اَبْصَارِهِمْ قائم مقام خبر مقدم ہے اور غِشَاوَةٌ مبتداء مؤخر نکرہ ہے جبکہ خبر محذوف ہے۔اسی طرح سے لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ میں لَهُمْ قائم مقام خبر مقدم ہے اور مرکب توصیفی عَذَابٌ عَظِيْمٌ مبتداء مؤخر نکرہ ہے اور خبر محذوف ہے۔

ترجمہ
البقرۃ:7

وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ	وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ط	عَلٰى قُلُوْبِهِمْ	اللّٰهُ	خَتَمَ
اور ان کی بصارتوں پر	اور ان کی سماعت پر	ان کے دلوں پر	اللہ نے	مہر لگا دی

عَذَابٌ عَظِيْمٌ ع ۝	وَّلَهُمْ	غِشَاوَةٌ ز
ایک عظیم عذاب ہے	اور ان کیلئے	ایک پردہ ہے

نوٹ:1 <u>ختم قلوب کی حقیقت:</u> دلوں پر مہر لگ جانے کے مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں:

''اللہ کی طرف سے مہر لگ جانے کا یہ فعل بندہ کے کفر اختیاری کے بعد ہوتا ہے نہ کہ اس کے قبل۔اس کا نتیجہ ہوتا ہے نہ کہ اس کا سبب۔فطرتِ سلیم ہر انسان کو عطا ہوئی ہے، اور اس میں دلائل حق پر غور و فکر کی استعداد بھی شامل ہے۔لیکن انسان جب اپنے ارادہ و عقل کا غلط استعمال کرنے لگتا ہے، اور آسمانی ہدایتوں اور خداوندی نشانیوں سے مسلسل منہ موڑے ہوئے قانونِ شیطانی پر چلنے کی ٹھان لیتا ہے تو سلسلۂ غضبی کے تحت میں آجاتا ہے۔انبیاء علیہم السلام کے سلسلۂ رحمت سے خارج ہو جاتا ہے، اور نصرتِ الٰہی اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔اب ہر روشنی اسے تاریک اور ہر تاریکی اسے روشن نظر آنے لگتی ہے۔اس نے اپنے لیے جو کچھ اختیار کیا، وہی اللہ تعالیٰ اسے بحیثیت علت العلل و مسبب الاسباب اپنے قانونِ تکوینی (نہ کہ قانونِ رضا) کے ماتحت دینے لگتا ہے۔اور یہی معنی ہیں انسان کے عقل و حواس پر مہر لگ جانے کے۔ورنہ ظاہر ہے کہ یہ مہر خداوندی کوئی مادی چیز نہیں۔''(تفسیر ماجدی،ص۹)۔

پیر کرم شاہ صاحبؒ سادہ الفاظ میں ختم قلوب کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:''یہاں بھی بعض لوگوں کو یہ کہتے سنا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی اور آنکھوں پر پردے ڈال دیئے تو غریب کیونکر ایمان لاتے۔اُن کی خدمت میں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ انسان کے اعمال پر

کوئی نتیجہ اور اثر مرتب ہوتا ہے یا نہیں؟ اگر انسان جسمانی صحت کے اصولوں کو لگاتار توڑتا رہے تو اس کا بلانوش معدہ جو ہر چیز ہضم کر لیا کرتا تھا کیا غذا ہضم کرنے سے معذور نہیں ہو جاتا؟ کیا اس کا جگر خون پیدا کرنا چھوڑ نہیں دیتا؟ اگر ایسا ہے اور یقیناً ایسا ہی ہے تو رُوحانی صحت کے بھی چند اُصول ہیں جن کی پابندی سے رُوحانی قوتیں نشوونما پاتی ہیں۔ اور جن کی پیہم خلاف ورزیوں سے وہ قوتیں ناکارہ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ دل سے حق و باطل میں تمیز کرنے کی صلاحیت سلب ہو جاتی ہے۔ آنکھیں دیکھتی تو ہیں لیکن عبرت حاصل نہیں کرتیں۔ کان سنتے تو ہیں لیکن نصیحت قبول نہیں کرتے۔ بس اسی کیفیت کا اللہ تعالیٰ نے اِس آیت میں ذکر فرمایا ہے۔ ان کفار کی پیہم نافرمانیوں سے، حق سمجھ لینے کے باوجود اس سے مسلسل انکار کرنے کی وجہ سے ان کے دل و دماغ اور دیدہ و گوش (دیکھنا اور سننا) کی ساری قوتیں ناکارہ ہو کر رہ گئی ہیں۔ تو ان کی یہ محرومیاں نتیجہ ہیں ان مسلسل نافرمانیوں کا۔ اور طبعی اثر ہے اُن کی ہٹ دھرمی اور تعصب کا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ پہلے ہی انہیں ہوش و فہم سے محروم کر دیا گیا تھا تاکہ وہ حق کو سمجھ ہی نہ سکیں۔ اِس حقیقت کو قرآن کریم نے متعدد موقعوں پر اس قدر واضح فرمایا ہے کہ غلط فہمی کی گنجائش تک باقی نہیں چھوڑی۔ مثلاً ایک جگہ ارشاد ہے بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ (النساء:155) یعنی ان کے کفر و انکار کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اُن کے دلوں پر مہر لگا دی۔ یعنی پہلے سے ان کے دل مہر شدہ نہ تھے بلکہ ان کے کفر و انکار اور اس پر ان کے شدید اصرار کی پاداش میں انہیں اس نعمت سے محروم کر دیا گیا۔ ایک اور جگہ ارشاد ہے كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (المطففین:14) یعنی جو کرتوت وہ کیا کرتے تھے اِن کا میل اُن کے دلوں پر جم گیا ہے اور ان کے دلوں کا روشن آئینہ اس قدر مکدّر ہو گیا ہے کہ آفتاب ہدایت کی روشن کرنیں اس میں چمک پیدا نہیں کر سکتیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حسن عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔'' (ضیاء القرآن، ج۱، ص۳۳)

نوٹ:2 حق قبول کرنے کی صلاحیت کے ماند پڑ جانے یا ختم ہو جانے کے لیے قرآن مجید میں تین طرح کی اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں۔ ان میں سے پہلا درجہ ہے دلوں پہ زنگ لگنے کا جس کو قرآن نے ﴿ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ ﴾ کہا ہے۔ اس سے اگلا درجہ دلوں پر مہر لگ جانے کا ہے۔ جس کے لیے قرآن نے ﴿ خَتَمَ اللّٰهُ ﴾ یا ﴿ طَبَعَ اللّٰهُ ﴾ کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اور آخری اور سب سے سخت درجہ ہے دلوں پر تالے لگ جانے کا جس کو قرآن نے یوں فرمایا ﴿ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ﴾ چنانچہ حضرت مولانا ادریس کاندھلوی صاحبؒ اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مومن جب کوئی گناہ کرتا ہے تو ایک سیاہ نقطہ اس کے قلب پر لگ جاتا ہے پس اگر توبہ کر لی اور اس گناہ سے باز آ گیا تو دل کو صاف کر دیا جاتا ہے اور اگر کوئی اور گناہ کیا تو وہ نقطہ اور بڑھ جاتا ہے حتیٰ کہ رفتہ رفتہ اس کے دل کو گھیر لیتا ہے اور یہی وہ رَیْن (زنگ) ہے جس کی حق تعالیٰ نے ﴿ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴾ میں خبر دی ہے۔ (رواہ الترمذی وقال حدیث حسن صحیح، پوری حدیث کے لیے ملاحظہ ہو مظاہر حق جدید، شرح مشکوٰۃ شریف، ج۲، ص۵۴۱)۔ پس جس طرح ہم ظاہری سیاہی اور سفیدی اور زنگ کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اس سے کہیں زائد ملائکہ اللہ قلوب بنی آدم کی سیاہی اور سفیدی اور زنگ کا معائنہ کرتے ہیں مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ رَیْن یعنی زنگ کا درجہ ختم اور طبع سے کم ہے اور ختم اور طبع کا درجہ اقفال سے کم ہے اور اقفال سب سے زائد سخت ہیں۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ﴾ کیا ان کے دلوں پر قفل ہیں۔'' (معارف القرآن، ج۱، ص۷۰)

آیت:8

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۘ ﴾

انسان: اس کے مادے کے بارے میں اختلاف ہے۔

(1) پہلی رائے یہ ہے کہ انسان ''ءن س'' (س) اِنْسٌ یا اُنْسٌ، سے ہے جس کے معنی ہیں مانوس ہونا۔ چنانچہ انسان کا مطلب ہوگا ایسی مخلوق جو آپس میں انس (پیار و محبت) رکھتی ہو اور ایک دوسرے سے جان پہچان رکھتی ہو۔ اس لحاظ سے اس کی ضد وَحْشٌ ہوگی۔ شعر:

مَا سُمِّيَ الْاِنْسَانُ اِلَّا لِاِنْسِهٖ وَالْقَلْبُ قَلْبٌ لِاَنَّهٗ يَتَقَلَّبُ

انسان کا نام اس کے انس ہی کی وجہ سے رکھا گیا ہے اور دل، دل ہے اس لیے کہ وہ بدلتا رہتا ہے۔

(2) دوسری رائے یہ ہے کہ انسان ''ءن س'' (افعال) اِیْنَاسٌ، سے ہے۔ اس کے معنی ہیں دور سے دیکھنا، محسوس کرنا، کسی چیز کا ادراک کرنا۔ انسان کو اِنْسٌ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ بھی ظاہر ہے اور آنکھوں سے اس کا ادراک کیا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے اس کی ضد جَنٌّ ہوگی جس کے معنی ہیں پوشیدہ، مخفی۔ اسی سے جِنٌّ (جن) بنا ہے کیونکہ وہ ہماری آنکھوں سے پوشیدہ ہے۔

(3) تیسری رائے یہ ہے کہ انسان ''ن س ی'' (س) نَسْیًا، نِسْیَانًا، سے ہے۔ جس کے معنی ہیں بھول جانا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ انسان کو انسان یا اِنْسِیًّا اس لیے کہا گیا کہ اس سے عہد لیا گیا تھا جسے وہ بھول گیا۔ مقولہ ہے اَوَّلُ النَّاسِ اَوَّلُ نَاسٍ تمام انسانوں میں سب سے پہلا انسان وہ ہے جو سب سے پہلے بھولا۔

(4) چوتھی رائے یہ ہے کہ انسان ''ن وس'' (ن) نَوْسًا، سے ہے۔ جس کے معنی ہیں مضطرب ہونا، جھولنا، حرکت کرنا۔ اور انسان کو انسان اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کی طبیعت میں اضطراب ہے اور اس کا مزاج بدلتا رہتا ہے۔

اِنْسٌ اسم جنس ہے۔ واحد یعنی ایک شخص بھی مراد ہو سکتا ہے اور جمع یعنی تمام نوع انسانی (مذکر، مؤنث) بھی مراد ہو سکتی ہے۔ چنانچہ واحد اور جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ﴿ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّ لَا جَآنٌّ ﴾ (55/الرحمٰن:39) ''تو اس دن نہیں پوچھا جائے گا اس کے گناہ کے بارے میں کسی انسان سے اور نہ ہی کسی جن سے۔'' ﴿ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ ﴾ (6/الانعام:112) ''اور اسی طرح ہم نے بنایا ہر نبی کے لیے دشمن جنوں اور انسانوں کے شیطانوں کو۔'' واحد کے لیے اِنْسِیٌّ بھی استعمال ہوتا ہے۔ ﴿ فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا ﴾ (19/مریم:26) ''تو میں ہرگز بات نہیں کروں گی آج کے دن کسی انسان سے۔''

اِنْسَانٌ: یہ بھی اسم جنس ہے۔ یہ لفظ بول کر عموماً تمام بنی نوع انسان (مذکر مؤنث) مراد لیے جاتے ہیں۔ ''ال'' لگا دیں تو یہ اَلْاِنْسَانُ بن جائے گا۔ پھر ''ال'' جنس کا بھی ہو سکتا ہے، استغراق کا بھی، عہد خارجی یا عہد ذہنی کا بھی۔ ﴿ وَ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ﴾ (4/النساء:28) ''اور پیدا کیا گیا انسان کمزور۔'' یہاں 'ال' جنس کا ہے۔

اِنْسَانٌ اور اِنْسٌ کی جمع نَاسٌ، اُنَاسٌ اور اَنَاسِیٌّ ہے۔

نَاسٌ اس میں عمومیت پائی جاتی ہے۔ اس پر ''ال'' داخل ہو تو یہ اَلنَّاسُ بن جائے گا۔ اَلنَّاسُ اسم جمع ہے یعنی جو کسی جماعت پر بولا جائے۔ معنوی لحاظ سے اس سے حال اور مستقبل کے سب انسان مراد ہوتے ہیں، خواہ مرد ہوں یا عورتیں، بچے ہوں یا بڑے، اچھے ہوں یا برے، مسلمان ہوں یا کافر، سب کے لیے یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ البتہ خطابی صورت میں ایک فرق ہے اور وہ یہ ہے خطابی صورتوں میں الناس سے وہی لوگ مراد ہوں گے جن میں مخاطب ہونے کی صلاحیت ہے یعنی عاقل اور بالغ۔ دیوانے اور بچے اگرچہ الناس میں لُغَةً شامل ہیں لیکن خطابی شکل میں خطاب اُن کی طرف نہیں ہوتا۔ ﴿ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَ لَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ ﴾ (2/البقرۃ:24) ''لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا، اور یقیناً کبھی نہیں کر سکتے، تو ڈرو اُس آگ سے، جس کا ایندھن بنیں گے انسان اور پتھر۔''

اُنَاسٌ عموماً انسانوں کے ایک بڑے گروہ کو کہا جاتا ہے۔ جو تقسیم کار، قبیلہ یا کسی وجہ سے ایک دوسرے سے مختلف ہوں۔ ﴿ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ﴾ (2/البقرۃ:60) ''ہر قبیلے نے جان لیا کہ کون سی جگہ اس کے پانی لینے کی ہے۔''

اَنَاسِیٌّ یہ بھی عموماً انسانوں کے ایک بڑے گروہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ﴿ لِّنُحْيِيَ بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا وَّ نُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّ اَنَاسِيَّ كَثِيْرًا ﴾ (25/الفرقان:49) ''تا کہ ایک مُردہ علاقے کو اُس کے ذریعے زندگی بخشے اور اپنی مخلوق میں سے بہت سے جانوروں اور انسانوں کو سیراب کرے۔''

مَنْ مَنْ اسم ہے جو اکثر ذوی العقول (جو عقل رکھتے ہیں مثلاً انسان، جن اور فرشتے) کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ واحد، جمع، تثنیہ، مذکر، مؤنث سب کے لیے مَنْ ہی استعمال ہوتا ہے۔ مَنْ، شرطیہ، استفہامیہ، استفہامیہ انکاریہ، موصولہ اور موصوفہ ہو سکتا ہے۔ مَنْ کے صلہ، صفت وغیرہ میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی آیت میں کبھی تو اس کی ظاہری لفظی شکل کی رعایت کرتے ہوئے فعل کا صیغۂ واحد یا مفرد ضمیر عائد لائی جاتی ہے اور کبھی معنی کی رعایت

کرتے ہوئے فعل یا ضمیر کو جمع بھی لایا جاتا ہے، جیسے آیت زیر مطالعہ میں مَنْ کے بعد یَقُوْلُ واحد کا صیغہ لا کر اس کی لفظی رعایت کی گئی ہے (کیونکہ مَنْ اصلاً واحد لفظ ہے) اور آگے اٰمَنَّا جمع کا صیغہ لا کر اس کی معنوی رعایت کی گئی ہے کیونکہ مَنْ آیت میں جمع کے معنی میں آیا ہے۔ مَنْ کا ''ن'' ہمیشہ ساکن رہتا ہے اور اگر آگے ملانا ہو تو زیر دے کر ملایا جاتا ہے۔

ق و ل

(ن) قَوْلًا کہنا، بولنا۔ ﴿ وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ﴾ (2/البقرہ:30) ''اور جب کہا آپؐ کے رب نے بیشک میں بنانے والا ہوں زمین میں ایک خلیفہ۔'' قَالَ کا صلہ جب عَلٰی کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی ہوتے ہیں کسی کے خلاف کوئی بات گھڑ لینا، کسی پر بہتان لگانا۔ (ماجدیؒ)

قِیْلَ ماضی مجہول ہے۔ کہا گیا۔ ﴿ وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ﴾ (2/البقرۃ:11) ''اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ زمین پر فساد مت پھیلاؤ تو کہتے ہیں کہ ارے! ہم تو اصلاح کر رہے ہیں۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)

یُقَالُ مضارع مجہول ہے۔ کہا جاتا ہے۔ ﴿ مَا یُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِیْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ ﴾ (41/حٰمٓ السجدۃ:43) ''نہیں کہا جاتا آپ ﷺ سے مگر جو کہا گیا ہے رسولوں سے آپ ﷺ سے پہلے۔''

قِیْلٌ اسم ذات ہے۔ بات۔ ﴿ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِیْلًا ﴾ (4/النساء:122) ''اور اللہ سے زیادہ سچا کون ہے بلحاظ بات کے۔''

قَوْلٌ ج: اَقْوَالٌ۔ جمع کی جمع: اَقَاوِیْلُ۔ اسم ذات ہے۔ بات۔ ﴿ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِیْمٍ ۚ وَّ مَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ﴾ (69/الحاقۃ:40-41) ''یقیناً یہ ایک بزرگ رسول کا قول ہے اور یہ کسی شاعر کی بات نہیں ہے۔''

قُلْ ج: قُوْلُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو کہہ۔ ﴿ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ﴾ (2/البقرہ:140) ''آپ ﷺ کہیے تم لوگ زیادہ جانتے ہو یا اللہ۔''

قَآئِلٌ اسم الفاعل ہے۔ کہنے والا۔ ﴿ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا یُوْسُفَ ﴾ (12/یوسف:10) ''کہا ان میں سے ایک کہنے والے نے تم لوگ قتل مت کرو یوسفؑ کو۔''

(تفعّل) تَقَوُّلًا بات گھڑنا۔ کسی کی طرف ایسی بات منسوب کرنا جو اس نے نہیں کہی۔ اپنی طرف سے جھوٹ گھڑ لینا۔ اس کے ساتھ بھی عام طور پر عَلٰی کا صلہ استعمال ہوتا ہے۔ ﴿ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَیْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِیْلِ ۙ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْیَمِیْنِ ﴾ (69/الحاقۃ:44-45) ''اور اگر وہ غلط منسوب کرتے ہم پر باتوں میں کوئی تو ہم ضرور پکڑتے ان کو قوت کے ساتھ۔''

اٰمَنَّا اور مُؤْمِنِیْنَ (ء م ن): البقرۃ آیت 3 دیکھیں۔	اَللّٰهُ (ء ل ہ): آیت بسم اللہ دیکھیں۔
اَلْیَوْمِ: الفاتحہ آیت 3 دیکھیں۔	اَلْاٰخِرِ (ء خ ر): البقرۃ آیت 4 دیکھیں۔

ترکیب آیت زیر مطالعہ کی ترکیب پہلے ایک مثال سے سمجھ لیں۔ اگر ہم کہیں کہ مِنَ النَّاسِ كَافِرٌ تو اس میں مِنَ النَّاسِ قائم مقام خبر مقدم ہے جبکہ خبر مَوْجُوْدٌ محذوف ہے اور كَافِرٌ مبتداء موخر ہے۔ اس کا سادہ جملہ یوں ہوتا اَلْكَافِرُ مَوْجُوْدٌ مِنَ النَّاسِ اور اس کا مطلب ہوتا کہ کافر ''یعنی خاص کافر'' لوگوں میں موجود ہے۔ لیکن جب مبتداء کو موخر کر کے نکرہ کر دیا تو اب مِنَ النَّاسِ كَافِرٌ کا مطلب ہو گیا کہ لوگوں میں سے کوئی کافر ہے یعنی لوگوں میں سب کافر نہیں ہیں بلکہ کچھ کافر ہیں۔ یہ رعایت اردو میں لفظ ''بھی'' سے ادا ہوتی ہے۔ اس لئے اس جملہ کا ترجمہ ہوگا ''لوگوں میں کافر بھی ہیں''۔

چنانچہ وَمِنَ النَّاسِ میں ''وَ'' استئنافیہ ہے اور مِنَ النَّاسِ قائم مقام خبر مقدم ہے۔ مِنْ تبعیضیہ ہے (یعنی لوگوں میں سے کچھ لوگ)۔ خبر مَوْجُوْدٌ محذوف ہے اور مَنْ مبتدا مؤخر ہے۔ اور اس مَنْ کو موصول یا نکرہ موصوفہ، دونوں مانا گیا ہے۔ موصول ہونے کی صورت میں اگلا جملہ فعلیہ یَقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ

بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اس کا صلہ بنے گا۔نکرہ موصوفہ ماننے کی صورت میں یہ جملہ فعلیہ اس کی صفت بنے گا۔یَقُوْلُ کا صیغہ مَنْ کی لفظی رعایت کے لحاظ سے لایا گیا ہے۔جبکہ معنوی لحاظ سے یہ جمع ہے۔ترجمہ ہوگا ''وہ کہتے ہیں'' اور آگے اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وہ بات ہے جو وہ کہتے ہیں۔اس میں اٰمَنَّا فعل اور اس میں شامل ضمیر اس کا فاعل ہے اور اٰمَنَّا جمع کا صیغہ مَنْ کی معنوی رعایت کے لحاظ سے لایا گیا ہے۔اور آگے بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ متعلق فعل ہے۔ان کے درمیان ''وَ'' عطف کا ہے۔وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ میں ''وَ'' حالیہ ہے۔'مَا' نافیہ ہے، هُمْ مبتدا اور بِمُؤْمِنِيْنَ اس کی خبر۔'بِ' زائدہ تاکید کے لیے ہے۔حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اس اسلوب کے متعلق لکھتے ہیں ''قرآن مجید میں یہ ترکیب جہاں جہاں بھی آئی ہے وہاں اس وصف کی نفی کامل مراد رہی ہے۔وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ان میں ایمان ذرا بھی نہیں۔وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ آپ ﷺ کا پروردگار بندوں کے حق میں ذرا سا بھی ظالم نہیں ہے۔''

ترجمہ
البقرۃ:8

وَمِنَ النَّاسِ	مَنْ	يَّقُوْلُ	اٰمَنَّا
اور لوگوں میں سے	وہ (بھی) ہیں جو	کہتے ہیں	ہم ایمان لائے

بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ	وَ	مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝٨
اللہ پر اور آخری دن پر	حالانکہ	وہ لوگ ہرگز ایمان لانے والے نہیں ہیں

نوٹ:1 وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ، آیت کے اِس حصے کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں: ''یعنی ان کے دل میں ایمان کا گزر ذرّہ برابر بھی نہیں، ایمان انہیں چھو بھی نہیں گیا۔بِمُؤْمِنِيْنَ، حرف باء تاکید کے لیے ہے۔ظاہری سیاق کا تقاضا تھا کہ فعل ماقبل قَالُوْٓا اٰمَنَّا کی تردید و تغلیط میں ما اٰمنوا یا اسی قسم کا کوئی اور فعل ماضی ہی لایا جاتا (اور فعل میں ماضی حال یا مستقبل کا مفہوم ہوتا ہے) لیکن یہاں تاکید اور زور کے لیے بجائے فعل کے اسم فاعل لایا گیا، کہ ان لوگوں سے نفی ایمان کی، ماضی، حال، مستقل ہر زمانہ سے متعلق نکل آئے۔(تفسیر ماجدیؒ)

نوٹ:2 واؤ کی اقسام: آیت زیر مطالعہ میں تین مختلف طرح کے واؤ آئے ہیں۔شروع میں 'وْ' استئنافیہ ہے۔اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ میں 'وْ' عطف کا ہے اور وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ میں 'وْ' حالیہ ہے۔نوٹ کرلیں کہ واؤ کی بھی کئی قسمیں ہیں جن میں سے مندرجہ ذیل چار قسمیں زیادہ استعمال ہوتی ہیں۔

(1) واؤ قسمیہ: (عامل)۔اس کے معنی ہیں ''قسم ہے''۔اس کی پہچان یہ ہے کہ یہ صرف اسم پر داخل ہوتا ہے اور اپنے اسم کو جر دیتا ہے، جیسے وَالْعَصْرِ (قسم ہے زمانے کی)۔اس کے بعد دوبارہ واؤ آئے تو دوسرا واؤ عطف کا ہوگا۔جیسے وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ میں پہلا واؤ قسمیہ ہے اور دوسرا عطف کا ہے۔

(2) واؤ عاطفہ: (غیر عامل)۔اس کے معنی ہیں ''اور'' یہ واؤ دو چیزوں کو ایک حکم میں جمع کرنے کے لیے آتا ہے۔یہ غیر عامل ہوتا ہے یعنی کوئی اعرابی تبدیلی نہیں لاتا۔

(3) واؤ حالیہ: (غیر عامل)۔اس کے معنی ہوتے ہیں ''اس حال میں کہ یا حالانکہ''۔حال عام طور پر تو وہ نکرہ اسم ہوتا ہے جو فعل کے واقع ہونے کے وقت فاعل یا مفعول کی حالت کو بیان کرے۔یہ حالت نصب میں ہوتا ہے۔مثلاً جَاءَ الْاَمِيْرُ مَاشِيًا (سردار چلتا ہوا آیا) اس مثال میں مَاشِيًا حال ہے فاعل، اَلْاَمِيْرُ کا۔جس کا حال بیان کیا جائے اسے ذوالحال کہتے ہیں۔(قرآن مجید سے مثال: سورۂ آل عمران کی آیت 39 میں فرمایا: اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ، اس آیت مبارکہ میں مُصَدِّقًا، سَيِّدًا، حَصُوْرًا، نَبِيًّا، یہ سب حضرت یحییٰؑ کے حال ہیں)۔حال اسم کے علاوہ پورا جملہ (اسمیہ یا فعلیہ) بھی ہوسکتا ہے۔مثلاً جَاءَ الْخَلِيْلُ يَضْحَكُ (خلیل ہنستا ہوا آیا)۔اس میں جملہ فعلیہ يَضْحَكُ، خلیل کا حال ہے۔(قرآن مجید سے مثال: سورۂ البقرۃ کی آیت 15 میں فرمایا: وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ، اس آیت مبارکہ میں جملہ فعلیہ يَعْمَهُوْنَ حال ہے يَمُدُّهُمْ میں هُمْ ضمیر کا)۔کبھی حال اور ذوالحال کے درمیان ایک رابط (جوڑنے والے) کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ رابط اکثر واؤ ہوتا ہے جسے واؤ حالیہ کہا جاتا ہے۔مثلاً جَاءَ الرَّشِيْدُ وَهُوَ يَضْحَكُ۔رشید اس حال میں آیا کہ وہ ہنس رہا تھا۔اس میں جملہ اسمیہ هُوَ يَضْحَكُ، رشید کا حال ہے اور محلاً منصوب ہے۔درمیان میں 'وْ' حالیہ ہے۔(قرآن مجید سے مثال: سورۂ البقرۃ کی آیت زیر مطالعہ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ، میں 'وْ' حالیہ ہے اور جملہ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ حال

ہے مَنْ کا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک تعلیم کردہ دعا میں واؤ حالیہ اور واؤ عاطفہ کا فوری تقابل بہت واضح ہے۔ آپؐ نے فرمایا: اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ۔ اے اللہ میں تیری پناہ میں آتا ہوں۔ اَنْ اُشْرِكَ بِكَ۔ کہ میں (کسی کو) شریک کروں تیرے ساتھ۔ وَاَعْلَمُ۔ اس حال میں کہ (واؤ حالیہ) میں جانتا ہوں۔ وَاَسْتَغْفِرُكَ۔ اور (واؤ عاطفہ) میں مغفرت مانگتا ہوں تجھ سے بِمَا لَا اَعْلَمُ۔ اس کی جو میں نہیں جانتا۔

(4) واؤ استئنافیہ: (غیر عامل)۔ یہ وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں پچھلی بات کو چھوڑ کر نئی بات شروع کرنی ہو۔ چنانچہ اس کے بعد اگر فعل مضارع آئے تو وہ حالت رفع میں آتا ہے مثلاً لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ط وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اس مثال میں 'و' عاطفہ نہیں ہے۔ ورنہ لِّنُبَيِّنَ کی طرح نُقِرُّ بھی حالت نصب میں ہوتا۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ اس واؤ سے ایک نئی بات شروع کر دی گئی ہے جس کا پچھلی بات سے تعلق نہیں ہے۔ یہ واؤ بھی غیر عامل ہے۔ (واؤ کی اور بھی کئی قسمیں ہیں جو لغات القرآن حصہ ۶ سے دیکھی جا سکتی ہیں)۔

نوٹ: 3 مِنْ کی اقسام: ترکیب میں بتایا گیا ہے کہ "مِنَ النَّاسِ" میں مِنْ تبعیضیہ ہے۔ اب نوٹ کر لیں کہ مِنْ، جو حرف جر ہے، بھی کئی طرح سے استعمال ہوتا ہے۔

(1) مِنْ تبعیضیہ: اس کا مطلب ہوتا ہے "کسی چیز میں سے کچھ یا کل میں سے بعض"۔ جیسے وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ اور جو رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں یا آیت زیر مطالعہ میں فرمایا وَمِنَ النَّاسِ مَنْ اور لوگوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں..... وغیرہ۔

(2) مِنْ بیانیہ: یہ کسی چیز کی وضاحت اور بیان کے لیے آتا ہے۔ مثلاً البقرہ 155 میں فرمایا: وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ط "ہم تمہیں آزمائیں گے کسی چیز سے۔ پھر "کسی چیز" کی وضاحت کے لیے مِنْ بیانیہ آیا۔ یعنی وہ چیز ہے خوف، بھوک، الخ۔ اسی طرح الحج کی آیت 30 میں فرمایا: فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ "پس تم بچتے رہو گندگی سے پھر مِنْ بیانیہ سے اس گندگی کی وضاحت کی کہ وہ گندگی بت ہیں۔ سو تم بتوں سے بچتے رہو۔ پھر اسی طرح سورہ الفتح کی آیت 29 میں فرمایا: وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا یہاں بھی مِنْهُمْ میں مِنْ بیانیہ ہے (بحوالہ تفسیر ماجدیؒ) مراد سارے ہی صحابہؓ ہیں۔ آل عمران کی آیت 172 میں فرمایا: لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ یہاں بھی مِنْهُمْ میں مِنْ بیانیہ ہے یعنی تمام صحابہؓ ہی نیک اور متقی ہیں۔ (بحوالہ تفسیر ماجدیؒ)۔

(3) مِنْ سببیہ: یہ کسی حکم کی وجہ اور سبب بتانے کے لیے استعمال ہوتا ہے مثلاً البقرۃ کی آیت 202 میں فرمایا اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ط "انہی لوگوں کو بڑا حصہ ملے گا (دونوں جہانوں میں) بسبب اُن کی (نیک) کمائی کے۔" (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ اس آیت میں مِّمَّا میں مِنْ سببیہ ہے۔ یا سورۃ البقرۃ کی آیت 19 میں فرمایا: يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ "ٹھونستے ہیں اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں کڑک کے سبب۔" اس آیت میں بھی 'من' سببیہ ہے۔ یا سورۂ نوح کی آیت 25 میں فرمایا: مِمَّا خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا یہاں بھی مِنْ سببیہ ہے (بحوالہ تفسیر ماجدیؒ) اور 'ما' تاکید کے لیے۔ مطلب ہے اپنے گناہوں کی وجہ سے وہ غرق کیے گئے اور وہ آگ میں داخل ہوئے۔

(4) مِنْ زائدہ: مِنْ کبھی زائدہ بھی ہوتا ہے۔ مِنْ زائدہ یا تو تحسین کلام کے لیے آتا ہے یا عموم کا معنی پیدا کرنے کے لیے یا پھر تاکید کے لیے آتا ہے۔ جیسے الانعام کی آیت 59 میں فرمایا: وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اس میں وَّرَقَةٍ لفظاً مجرور ہے مِنْ زائدہ کی وجہ سے لیکن محلاً مرفوع ہے تَسْقُطُ کے فاعل ہونے کی وجہ سے۔ اگر ہوتا مَا تَسْقُطُ وَرَقَةٌ تو معنی ہوتے 'نہیں گرتا کوئی پتّا'..... لیکن مِنْ زائدہ لگ جانے کی وجہ سے وَرَقَةٌ میں تاکید اور عموم کے معنی پیدا ہوئے ہیں، اردو زبان میں اس کی ترجمانی ہوگی 'نہیں گرتا کوئی بھی پتّا'۔ اسی طرح سورۃ الانعام کی آیت 38 میں فرمایا: وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اس میں دَآبَّةٍ لفظاً مجرور ہے مِنْ زائدہ کی وجہ سے اور محلاً مرفوع ہے مبتدا ہونے کی وجہ سے، ترجمانی ہوگی 'نہیں ہے کوئی بھی چلنے والا زمین میں'۔ اسی آیت میں آگے فرمایا مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ..... شَيْءٍ لفظاً مجرور ہے مِنْ زائدہ کی وجہ سے لیکن محلاً منصوب ہے فَرَّطْنَا کے مفعول ہونے کی وجہ سے۔ ترجمانی ہوگی اور ہم نے نہیں چھوڑی لکھنے میں کوئی بھی چیز۔ اسی طرح کی اور کئی مثالیں قرآن مجید سے دیکھی جا سکتی ہیں۔ مِنْ زائدہ ہونے کے لیے تین شرطیں ہیں۔ (۱) اس سے پہلے نفی، نہی یا استفہام ہو۔ (۲) مجرور، نکرہ ہو۔ (۳) مجرور، فاعل، مفعول یا مبتدا ہو۔ (واللہ اعلم)

(5) مِنْ بمعنی عَنْ: یعنی مِنْ کا استعمال عَنْ کے معنوں میں جیسے فرمایا فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ط (الزمر:22) یہاں مِنْ سے مراد ہے عَنْ

ذِكْرِ اللّٰهِ۔ مطلب ہے اللہ کی یاد کو چھوڑ کر جن کے دل سخت پڑ گئے۔ان کے لیے وَيْلٌ ہے یا فرمایا یٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا (الانبیاء:97) یعنی ہائے اس کو چھوڑ کر ہم غفلت میں تھے۔ یہاں بھی مِنْ بمعنی عَنْ هٰذَا ہے۔

(6) مِنْ بمعنی 'بِ': یعنی مِنْ کا استعمال 'بِ' کے معنوں میں۔ جیسے فرمایا يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ ط (الشوریٰ:45) وہ دیکھیں گے چوری کی نگاہ سے۔ مِنْ یہاں 'بِ' کا ہم معنی ہے۔

(7) مِنْ بمعنی فِيْ: یعنی مِنْ کا استعمال فِيْ کے معنوں میں جیسے فرمایا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ (الجمعہ:9) یہاں مِنْ، فِيْ کا ہم معنی ہے۔

(8) مِنْ بمعنی عَلٰی: یعنی مِنْ کا استعمال عَلٰی کے معنوں میں جیسے فرمایا وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ط (الانبیاء:77) یہاں مِنَ الْقَوْمِ بمعنی عَلَى الْقَوْمِ ہے۔ (واللہ اعلم)

مِنْ کے اور بھی استعمالات ہیں جو کہ لغات القرآن حصہ پنجم سے دیکھے جا سکتے ہیں۔

آیت:9

﴿ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝ ﴾

خ د ع

(ف) خَدْعًا: دھوکا دینا۔ ﴿ وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ط ﴾ (8/الانفال:62) ''اور اگر وہ لوگ ارادہ کریں کہ وہ لوگ آپ ﷺ کو دھوکا دیں تو بیشک آپ ﷺ کے لئے اللہ کافی ہے۔''

خَادِعٌ: اسم الفاعل ہے۔ دھوکا دینے والا۔ ﴿ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ ﴾ (4/النساء:142) ''بے شک منافق (اپنے گمان میں) دھوکہ دے رہے ہیں اللہ کو اور اللہ تعالیٰ سزا دینے والا ہے انہیں (اس دھوکہ بازی کی)۔''

(مفاعلہ) خِدَاعًا: دوسرے کو دھوکا دینے کی کوشش کرنا۔ جو کچھ دل میں ہو اُس کے خلاف ظاہر کرنا۔ فریب دینا۔ آیت زیر مطالعہ۔

اَللّٰهُ (ء ل ہ): آیت بسم اللہ دیکھیں۔ اٰمَنُوْا (ء م ن): البقرۃ، آیت 3 دیکھیں۔

ن ف س

(ک) نَفَاسَةً: پسندیدہ ہونا۔ نفیس ہونا۔ قرآن مجید میں ثلاثی سے فعل استعمال نہیں ہوا۔

نَفْسٌ: ج: اَنْفُسٌ اور نُفُوْسٌ۔ عربی زبان میں یہ لفظ بہت وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً

(1) سانس کے لیے جو ناک اور منہ کے ذریعے بدن کے اندر جاتا ہے جس پر زندگی کا دارومدار ہے۔ (اس کے لیے نَفَسٌ بھی استعمال ہوتا ہے)۔

(2) زندگی یا حیات کے لیے۔

(3) ہر جان اور ہر جاندار کے لیے جیسے آل عمران۔185 میں فرمایا كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ط ''ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)

(4) انسانی وجود، آدمی، شخص کے لیے جیسے البقرۃ۔48 میں فرمایا وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا ''اور ڈرو

اُس دن سے کہ کام نہ آئے کوئی شخص کسی کے کچھ بھی۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) یا آیت 281 میں فرمایا وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۗ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ''اور ڈرتے رہو اُس دن سے کہ جس دن لوٹائے جاؤ گے اللہ کی طرف پھر پورا دیا جائے گا ہر شخص کو جو کچھ اس نے کمایا اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) یا آیت 44 میں فرمایا اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ ''کیا تم دوسرے لوگوں کو تو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ آیت زیر مطالعہ میں بھی اَنْفُسٌ انہیں معنوں میں ہے۔

(5) روح کے لیے۔ جیسے الانعام آیت۔93 میں فرمایا وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ اس آیت کا حضرت شیخ الہندؒ ترجمہ کرتے ہیں: ''اور اگر تو دیکھے جس وقت کہ ظالم ہوں موت کی سختیوں میں اور فرشتے اپنے ہاتھ بڑھا رہے ہیں کہ نکالو اپنی جانیں۔'' اور حاشیہ میں فرماتے ہیں: ''یعنی روح قبض کرنے اور سزا دینے کو ہاتھ بڑھا رہے ہیں۔'' اسی طرح حضرت عبدالماجد دریابادیؒ اس آیت کا ترجمہ کرتے ہیں: ''کاش آپؐ اُس وقت دیکھیں جب (یہ) ظالم موت کی سختیوں میں ہوں گے اور فرشتے اپنے ہاتھ (اُن کی طرف) بڑھا رہے ہوں کہ اپنی جانیں (جلد) نکالو۔'' اور آگے حاشیہ میں فرماتے ہیں: ''اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ سے یہ بھی صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ انسان کی جان یا روح اس کے جسم سے الگ یا مغایر ایک چیز ہے۔'' صاحبؒ مفردات القران نے بھی نفس بمعنی روح کے تحت یہی آیت حوالے کے طور پر لکھی ہے۔ یا فرمایا الزمر آیت۔42 میں اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ اللہ ہی روحوں کو ان کی موت کے وقت اور جن کی موت نہیں آئی انہیں ان کی نیند کے وقت قبض کر لیتا ہے، پھر جن پر موت کا حکم لگا چکا ہے انہیں تو روک لیتا ہے اور دوسری (روحوں) کو ایک مقرر وقت تک کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔'' (ترجمہ احسن البیان)، حضرت پیر کرم شاہ صاحبؒ اس آیت کا ترجمہ یوں کرتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ قبض کرتا ہے جانوں کو موت کے وقت اور جن کی موت کا وقت ابھی نہیں آیا (ان کی روحیں) حالت نیند میں، پھر روک لیتا ہے ان روحوں کو جن کی موت کا فیصلہ کرتا ہے۔ اور واپس بھیج دیتا ہے دوسری رُوحوں کو مقرر میعاد تک۔'' تفسیر معارف القرآن میں بھی حضرت مفتی محمد شفیعؒ نے اس آیت میں نفس سے روح ہی مراد لی ہے۔ (واللہ اعلم)

(6) دل، جی کے لیے۔ جیسے المائدۃ کی آیت۔116 میں فرمایا تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ؕ ''تو جانتا ہے جو کچھ میرے دل میں ہے اور میں نہیں جانتا جو کچھ تیرے دل میں ہے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ) یا بنی اسراءیل کی آیت۔25 میں فرمایا: رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ؕ ''تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے اُس کو جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ) ''تمہارا رب خوب جانتا ہے جو تمہارے جی میں ہے۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)

(7) نفس بمعنی ذات۔ آل عمران کی آیت۔30 میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ ''اور اللہ تم کو اپنی ذات سے ڈراتا ہے۔'' اس آیت کی وضاحت کرتے ہوئے امام راغبؒ فرماتے ہیں: ''اس آیت میں نفس بمعنی ذات ہے۔ اور یہاں نَفْسَهٗ کی اضافت اگرچہ لفظی لحاظ سے مضاف اور مضاف الیہ میں مغایرۃ کو چاہتی ہے لیکن من حیث المعنی دونوں سے ایک ہی ذات مراد ہے۔ کیونکہ ذات باری تعالیٰ ہر قسم کی دوئی سے پاک ہے۔'' (مفردات القرآن، ج ۲، ص: ۱۰۷۰) یا المائدۃ کی آیت۔116 میں فرمایا وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ؕ اور میں نہیں جانتا جو کچھ تیرے دل میں ہے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ) آگے حاشیہ میں حضرتؒ فرماتے ہیں: ''مَا فِيْ نَفْسِكَ بعض اہل باطل نے حق تعالیٰ کی تجسیم نکالنا چاہی ہے، اور

کہا ہے کہ نفس سے مراد شخص ہوتی ہے۔لیکن جیسا کہ امام رازیؒ نے فرمایا اوّل تو نفس و ذات مرادف ہیں۔شخصیت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔اور پھر نَفْسِیْ کے مقابلہ میں نَفْسِكَ لانا ہی بہ قاعدۂ مشاکلت عربی اسلوب بیان میں فصیح تر ہے۔'' (تفسیر ماجدیؒ۔۳۱۹)۔

نفس سے اگر روح اور جان مراد ہو تو مؤنث استعمال ہوتا ہے اور اگر شخص مراد ہو تو مذکر استعمال ہوتا ہے۔

نفس کی تین حالتیں: نفس مطمئنہ، نفس امّارہ، نفس لوّامہ: نفس کی تین حالتوں کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں: ''محققین نے لکھا ہے کہ آدمی کا نفس ایک چیز ہے لیکن اس کی تین حالتوں کے اعتبار سے تین نام ہو گئے ہیں۔اگر نفس عالم علوی کی طرف مائل ہوا اور اللہ کی عبادت و فرمانبرداری میں اس کو خوشی حاصل ہوئی اور شریعت کی پیروی میں سکون اور چین محسوس کیا اُس نفس کو ''مطمئنہ'' کہتے ہیں۔ يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ○ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً (الفجر۔27-28) اور اگر عالم سفلی کی طرف جھک پڑا اور دنیا کی لذات و خواہشات میں پھنس کر بدی کی طرف رغبت کی اور شریعت کی پیروی سے بھاگا اُس کو ''نفس امارہ'' کہتے ہیں کیونکہ وہ آدمی کو برائی کا حکم کرتا ہے۔وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ۭ (یوسف۔53) اور اگر کبھی عالم سفلی کی طرف جھکتا اور شہوت و غضب میں مبتلا ہوتا ہے اور کبھی عالم علوی کی طرف مائل ہو کر اُن چیزوں کو برا جانتا ہے اور اُن سے دُور بھاگتا ہے اور کوئی برائی یا کوتاہی ہو جانے پر شرمندہ ہو کر اپنے تئیں ملامت کرتا ہے اُس کو ''نفس لوامہ'' کہتے ہیں۔حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں ''آدمی کا جی اوّل کھیل میں اور مزوں میں غرق ہوتا ہے ہرگز نیکی کی طرف رغبت نہیں کرتا۔ایسے جی کو ''امارہ بالسُّوء'' کہتے ہیں۔پھر ہوش پکڑا، نیک و بد سمجھا تو باز آیا کبھی (غفلت ہوئی تو) اپنی خو پر دوڑ پڑا پیچھے کچھ سمجھ آئی تو اپنے کیے پر پچھتانے اور ملامت کرنے لگا۔ایسا نفس (جی) ''لوامہ'' کہلاتا ہے پھر جب پورا سنور گیا، دل سے رغبت نیکی ہی پر ہو گئی بیہودہ کام سے خود بخود بھاگنے لگا اور بدی کے ارتکاب بلکہ تصور سے تکلیف پہنچنے لگی وہ نفس ''مطمئنہ'' ہو گیا۔'' (تفسیر عثمانیؒ۔۷۶۶)

(تفعّل) تَنَفُّسًا سانس لینا، ظاہر ہونا۔﴿ وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ ۙ﴾ (81/التکویر:18) ''قسم ہے صبح کی جب وہ سانس لے یعنی ظاہر ہو۔''

(تفاعل) تَنَافُسًا اس کا معنی ہے کہ چند آدمیوں کا کسی خاص مرغوب و محبوب چیز کو حاصل کرنے کے لیے جھپٹنا اور دوڑنا تاکہ دوسروں سے پہلے وہ اس کو حاصل کر لے۔بطور مقابلہ رغبت کرنا۔کسی چیز کے لئے جان کھپانا۔﴿ وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ۭ﴾ (83/المطففین:26) ''اور اس میں چاہئے کہ جان کھپائیں جان کھپانے والے۔''

مُتَنَافِسٌ ج: مُتَنَافِسُوْنَ۔اسم الفاعل ہے۔جان کھپانے والا۔اوپر آیت 26 دیکھیں سورۂ المطففین کی۔

ش	ع	ر

(ن) شَعْرًا کسی چیز میں بال بھرنا یا لگانا۔

شُعُوْرًا، شِعْرًا بال کی طرح باریک علم حاصل کرنا۔''حواس'' سے کسی محسوس چیز کا ادراک حاصل کرنا۔شعور حاصل کرنا۔حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں: ''شعور عربی میں علم حسی کو کہتے ہیں۔اور اسی کا نام اُردو میں احساس ہے اور مَشَاعِرٌ انسان کے آلاتِ حواس کو کہتے ہیں۔'' ﴿ اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰي رَبِّيْ لَوْ تَشْعُرُوْنَ ۚ﴾ (26/الشعراء:113) ''نہیں ہے ان کا حساب مگر میرے رب کے ذمہ، کاش تم لوگ شعور سے کام لیتے۔''

علم لطیف میں کلام کرنا یعنی شعر کہنا۔

شَعْرٌ ج: اَشْعَارٌ۔اسم ذات ہے۔بال۔ ﴿وَ مِنْ اَصْوَافِهَا وَ اَوْبَارِهَا وَ اَشْعَارِهَآ اَثَاثًا﴾(16/النحل:80)''اور(اسی نے بنائے ہیں) بھیڑوں کی صوف اوراونٹوں کی اون اور بکریوں کے بالوں سے مختلف گھریلوسامان۔''(ترجمہ ضیاءالقرآن)

شِعْرٌ ج:اَشْعَارٌ۔اسم ذات ہے۔موزوں(مناسب،درست،وزن میں ہونا) کلام۔شعر۔شعراصل میں لطیف علم کا نام ہے لیکن عرف عام میں موزوں اور مقفّٰی کلام کوشعر کہا جانے لگا۔یعنی وہ کلام جس کا وزن بھی ہو اور قافیہ بھی۔اور شعر کہنے والے کوشاعر کہا جاتا ہے۔کفار حضورؐ کوشاعر اور قرآن مجید کوشعر کہا کرتے تھے۔لیکن بعض حقیقت شناس لوگوں نے کہا ہے کہ حضورؐ پر شاعر ہونے کی تہمت لگانے سے کفار کا مقصد موزوں اور مقفّٰی کلام بنانے کی تہمت لگانا نہیں تھا کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ قرآن اسلوب شعری سے بہت بلند ہے اور اس حقیقت کو عجمی عوام بھی سمجھ سکتے ہیں پھر فصحاء عرب کا کیا ذکر ہے۔بلکہ وہ تو آپؐ پر(نعوذ باللہ) جھوٹ کی تہمت لگاتے تھے کیونکہ عربی زبان میں شعر بمعنی کذب (جھوٹ) اور شاعر بمعنی کاذب (جھوٹا) استعمال ہوتا ہے حتیٰ کہ جھوٹے دلائل کو اَدِلَّةٌ شِعْرِيَةٌ کہا جاتا ہے۔اسی لیے قرآن نے شعراء کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ اور شاعروں کی پیروی گمراہ لوگ کیا کرتے ہیں اور شعر چونکہ جھوٹ کا پلندہ ہوتا ہے اس لیے مقولہ مشہور ہے کہ اَحْسَنُ الشِّعْرِ اَكْذَبُهٗ۔سب سے بہتر شعر وہ ہے جو سب سے زیادہ جھوٹ پر مشتمل ہو۔اسی لیے قرآن مجید میں فرمایا گیا﴿وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ﴾ (36/یٰسین:69)''اور ہم نے تعلیم نہیں دی انؐ کو شاعری کی اور یہ شایان شان بھی نہیں ہے انؐ کے۔''

شَاعِرٌ ج: شُعَرَآءُ ۔اسم الفاعل ہے۔شعر کہنے والا۔ ﴿وَّ مَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ﴾(69/الحاقۃ:41)''اور یہ کسی شعر کہنے والے کا کلام نہیں ہے۔''﴿وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ﴾(26/الشعراء:224) ''اور شاعر لوگ،ان کی پیروی کرتے ہیں گمراہ لوگ۔''

شَعِيْرَةٌ ج: شَعَآئِرُ۔اسم ذات ہے۔علامت یا نشان۔ ﴿اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ﴾(2/البقرہ:158)''بیشک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔''شعائر اللہ سے وہ مقامات عبادت،زمانے،اوقات،اعمال یا مخصوص اشیاء مراد ہیں،جن کو اللہ تعالیٰ نے دین کی علامتیں قرار دیا ہے۔مقامات عبادت میں کعبۃ اللہ،عرفہ،مزدلفہ،منیٰ،جمرات ثلاثہ، صفا،مروہ،اور تمام مساجد شامل ہیں۔زمانے یا اوقات میں ماہ رمضان،حج کے ایام،عیدین،اشہر حرم،ایام تشریق اور جمعہ شامل ہیں۔اعمال میں اذان،اقامت،باجماعت نماز اور نماز عیدین شامل ہیں۔مخصوص اشیاء میں قربانی کے جانور، احرام،کتب سماویہ،یہاں تک کہ تمام حدود وفرائض شامل ہیں۔حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں:''شَعَآئِرِ اللّٰهِ یعنی اللہ کے دین کی نشانیاں یا علامتیں،دین الٰہی کے وہ شعائر جو طاعتوں میں بطور علم کام دیں۔شَعَآئِرِ جمع ہے شعیرہ کی اور اس کے معنی ہیں علامت کے۔اصطلاح میں مراد مناسک حج کی علامتیں ہیں۔''حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ حصہ اول باب ۷،شعائر اللہ کی تعظیم واحترام میں فرماتے ہیں:''شعائر الٰہیہ سے ہماری مراد وہ ظاہری ومحسوس امور اور اشیاء ہیں جن کا تقرر اسی لیے ہوا ہے کہ ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جائے۔ان امور واشیاء کو خدا کی ذات سے ایسی مخصوص نسبت ہے کہ ان کی عظمت وحرمت کو لوگ خود اللہ تعالیٰ کی عظمت وحرمت سمجھتے ہیں۔اور ان کے متعلق کسی قسم کی کوتاہی کو ذات الٰہی کے متعلق کوتاہی سمجھتے ہیں۔''پھر آگے چل کر فرماتے ہیں:''بڑے بڑے شعائر الٰہیہ چار ہیں،قرآن حکیم،کعبۃ اللہ،نبی کریمؐ اور نماز۔''شعائر اللہ کی مزید وضاحت،اگر اللہ نے چاہا،تو اسی سورہ مبارکہ کی آیت 158 کے تحت کی جائے گی۔

مَشْعَرٌ (1) نشانی یا علامت۔
(2) اسم الظرف ہے۔ شعور حاصل کرنے کی جگہ۔ ﴿فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ﴾ (2/البقرہ:198) ''پس جب تم لوگ فارغ ہو عرفات سے تو یاد کرو اللہ کو شعور حاصل کرنے کی محترم جگہ کے پاس۔'' اَلْمَشْعَرُ الْحَرَامُ: مشعر حرام ایک پہاڑ کا نام ہے، جو مزدلفہ میں واقع ہے، مشعر کے معنی شعار اور علامت کے ہیں اور حرام بمعنی محترم و مقدس کے ہے، معنی یہ ہیں کہ یہ پہاڑ شعار اسلام کے اظہار کے لیے ایک مقدس مقام ہے، اس کے آس پاس کے میدان کو مزدلفہ کہتے ہیں۔ (معارف القرآن، ج ۱، ص ۴۸۸)۔ ''مشعر کے لفظی معنی نشانی یا علامت کے ہیں۔ اور حرام یعنی محترم یا مقدس اس کی تعظیمی صفت ہے۔ نام اُس خاص مقام کا بھی ہے، جو مزدلفہ کی دو پہاڑیوں کے درمیان ہے، اور خود سارے مزدلفہ کو بھی المشعر الحرام ہی کہتے ہیں۔'' (تفسیر ماجدیؒ۔ ۱۰۳)

(افعال) اِشْعَارًا خبر دینا۔ شعور دینا۔ آگاہ کرنا۔ ﴿فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَ لْيَتَلَطَّفْ وَ لَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا﴾ (18/الکہف:19) ''پس اسے چاہیے کہ وہ تمہارے لیے لائے اس میں سے کچھ کھانا اور چاہیے کہ وہ نرمی کرے اور ہرگز اطلاع نہ دے تمہاری کسی ایک کو۔''

ترکیب يُخٰدِعُوْنَ فعل، اس میں جمع مذکر غائب کی ضمیر فاعل ہے۔ لفظ اَللّٰهَ منصوب ہونے کی وجہ سے مفعول اول ہے اور وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مفعول ثانی ہے۔ آگے 'وَ' حالیہ ہے اور 'مَا' نافیہ ہے۔ مَا يَخْدَعُوْنَ منفی جملہ ہے جس کا استثنیٰ آگے اِلَّا سے بیان ہوا ہے اور یہ تاکید کے لیے ہے۔ یہ بھی بات میں زور پیدا کرنے کا ایک انداز ہے۔ مثلاً اگر ہم کہیں کہ اللہ ہے، تو یہ ایک سادہ سی خبر ہے۔ مگر جب ہم کہتے ہیں کہ کوئی الٰہ نہیں ہے سوائے اللہ کے تو خبر وہی رہتی ہے لیکن بات کا لہجہ بالکل تبدیل ہو جاتا ہے۔ نوٹ کریں کہ یہاں يَخْدَعُوْنَ اَنْفُسَهُمْ (وہ لوگ اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں)، کہنے کے بجائے مَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّا اَنْفُسَهُمْ (وہ لوگ دھوکا نہیں دیتے مگر اپنے آپ کو) کہا گیا ہے۔ اَنْفُسَهُمْ مفعول بِہٖ ہے يَخْدَعُوْنَ کا۔ آگے 'وَ' عطف کا ہے اور مَا يَشْعُرُوْنَ عطف ہے جملہ مَا يَخْدَعُوْنَ پر۔ اس 'وَ' کو استئنافیہ اور حالیہ بھی مانا گیا ہے۔

ترجمہ
البقرۃ:9

يُخٰدِعُوْنَ	اللّٰهَ	وَالَّذِيْنَ	اٰمَنُوْا ۚ
وہ لوگ دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں	اللہ کو	اور ان لوگوں کو جو	ایمان لائے

وَ	مَا يَخْدَعُوْنَ	اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ	وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝
حالانکہ	وہ لوگ دھوکہ نہیں دیتے	مگر اپنے آپ کو	اور نہ ہی وہ لوگ سمجھتے ہیں

نوٹ:1 يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ: ''مخادعت کے معنی ہیں دھوکا دینے کی کوشش کرنا عام اس سے کہ وہ دھوکا کامیاب ہو سکے یا نہ ہو سکے۔ یہاں مخادعت کا لفظ بھی استعمال فرمایا ہے اور خدع کا لفظ بھی استعمال فرمایا ہے، جہاں لفظ کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے وہاں تو مخادعت استعمال ہوا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینے کی خواہش تو کوئی شخص اپنی حماقت کے سبب سے کر سکتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس کو دھوکا دے نہیں سکتا۔ برعکس اس کے خود ان کے لیے خدع کا لفظ استعمال ہوا ہے کیونکہ جو شخص خدا کو دھوکا دینے کا ارادہ کرتا ہے وہ اپنی اس کوشش میں تو ناکام رہتا ہے لیکن خود اپنے آپ کو وہ ضرور دھوکے میں ڈال دیتا ہے۔'' (تدبر قرآن، ج ۱، ص ۱۱۸)

نوٹ:2 وَمَا يَشْعُرُوْنَ: ''شعور کا لفظ کسی محسوس چیز کے ادراک کے لیے آیا کرتا ہے۔ یہاں اس لفظ کا استعمال اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ اگرچہ خدا کو دھوکہ دینے کی کوشش میں خود دھوکا کھا جانا ایک محسوس ہونے والی چیز ہے لیکن یہ برخود غلط لوگ ہوشیاری و چالاکی کے زعم کے باوجود اتنے غبی

ہیں کہ اس حقیقت کا احساس نہیں کر رہے ہیں کیونکہ ابھی اس کا نتیجہ ان کے سامنے نہیں آیا ہے۔'' (تدبر قرآن، ج ۱، ص ۱۱۹)

آیت: 10

﴿ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَہُمُ اللّٰہُ مَرَضًا ۚ وَ لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌۢ ۬ۙ بِمَا کَانُوۡا یَکۡذِبُوۡنَ ﴿۱۰﴾ ﴾

قُلُوبٌ (ق ل ب): البقرۃ آیت 7 دیکھیں۔

م ر ض

(س) **مَرَضًا** بیمار ہونا۔ ﴿ وَ اِذَا مَرِضۡتُ فَہُوَ یَشۡفِیۡنِ ﴿۸۰﴾ ﴾ (26/الشعراء:80) ''اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہ مجھے شفا دیتا ہے۔''

مَرَضٌ اور **مَرْضٌ** اسم ذات ہے۔ بیماری۔ اس کی دو قسمیں ہیں (ا) مرض جسمانی: مثلاً لَّا عَلَی الۡمَرِیۡضِ حَرَجٌ ''اور نہ بیمار آدمی پر الزام ہے۔'' (ب) مرض اخلاقی: مرض کا لفظ اخلاق کے بگڑنے پر بھی بولا جاتا ہے اس سے برے اخلاق مراد ہوتے ہیں مثلاً: شک، بزدلی، جہالت، حسد، نفاق وغیرہ۔ جس طرح جسمانی مرض انسان کے بدن کو کمزور کرتے ہیں اسی طرح برے اخلاق انسان کے دین کو کمزور کرتے ہیں مثلاً: آیت زیر مطالعہ اور ﴿ وَ اِذۡ یَقُوۡلُ الۡمُنٰفِقُوۡنَ وَ الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰہُ وَ رَسُوۡلُہٗۤ اِلَّا غُرُوۡرًا ﴿۱۲﴾ ﴾ (33/الاحزاب:12) ''اور جب کہا منافقوں نے اور ان لوگوں نے جن کے دلوں میں مرض ہے ہم سے وعدہ نہیں کیا اللہ نے اور اس کے رسول نے مگر فریب کا۔'' حضرت مولانا مفتی محمد شفیع 'مرض' کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''مرض اور بیماری اس کیفیت کو کہتے ہیں جس سے انسان اپنے اعتدال مناسب سے نکل جائے، اور اس کے افعال میں خلل پیدا ہو جائے، جس کا آخری نتیجہ ہلاکت اور موت ہوتا ہے۔ قرآن و حدیث کی اصطلاح میں اُن نفسانی کیفیات کو بھی مرض کہا جاتا ہے جو نفس انسانی کے کمال میں خلل انداز ہوں، اور جن کی وجہ سے انسان اپنے انسانی اعمال سے محروم ہوتا چلا جائے جس کا آخری نتیجہ روحانی موت و ہلاکت ہے۔'' (معارف القرآن، ج ۱، ص: ۱۲۴)۔ صاحبؒ تدبر قرآن فرماتے ہیں: ''مرض کا لفظ قرآن میں عموماً دو معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک کینہ اور حسد کے معنی میں۔ دوسرے نفاق کے معنی میں۔ جن مقامات میں یہ لفظ نفاق کے ساتھ استعمال ہوا ہے وہاں تو یہ واضح طور پر کینہ اور حسد کے معنی میں ہے لیکن جن مقامات میں یہ تنہا استعمال ہوا ہے۔ وہاں یا تو دونوں معانی اس کے اندر جمع ہیں یا قرینہ اس کے دونوں معانی میں سے کسی ایک معنی کو متعین کرتا ہے۔'' (تدبر قرآن، ج ۱، ص ۱۱۹)۔

مَرِیۡضٌ ج: مَرْضٰی - فَعِیۡلٌ کے وزن پر صفت ہے۔ بیمار۔ ﴿ وَ مَنۡ کَانَ مَرِیۡضًا اَوۡ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِّنۡ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ ﴾ (2/البقرۃ:185) ''اور جو مریض ہو یا سفر پر ہو تو گنتی ہے یعنی شمار پورا کرنا ہے دوسرے دنوں میں۔'' ﴿ وَ لَا جُنَاحَ عَلَیۡکُمۡ اِنۡ کَانَ بِکُمۡ اَذًی مِّنۡ مَّطَرٍ اَوۡ کُنۡتُمۡ مَّرۡضٰۤی اَنۡ تَضَعُوۡۤا اَسۡلِحَتَکُمۡ ۚ ﴾ (4/النساء:102) ''اور کوئی گناہ نہیں ہے تم لوگوں پر اگر تم میں ہوں کچھ لوگ تکلیف میں بارش کے سبب سے، یا تم ہو بیمار، کہ تم کھول دو اپنے ہتھیار۔''

ز ی د

(ض) **زِیَادَۃً، زَیۡدًا، مَزِیۡدًا** (1) بڑھنا، زیادہ ہونا (لازم)۔ ﴿ وَ اَرۡسَلۡنٰہُ اِلٰی مِائَۃِ اَلۡفٍ اَوۡ یَزِیۡدُوۡنَ ﴿۱۴۷﴾ ﴾ (37/الصافات:147) ''اور ہم نے بھیجا اُنؑ کو ایک لاکھ لوگوں کی طرف یا وہ لوگ زیادہ ہوں گے۔''

(2) کسی چیز کے پورا ہونے پر اس میں اضافہ کرنا، بڑھانا، زیادہ کرنا (متعدی)۔ ﴿ اِنَّہُمۡ فِتۡیَۃٌ اٰمَنُوۡا بِرَبِّہِمۡ وَ

زِدْنٰهُمْ هُدًى ﴿۱۳﴾ ﴾(18/الکہف:13)''بیشک وہ کچھ نوجوان تھے جو ایمان لائے اپنے رب پر اور ہم نے بڑھایا ان کو بلحاظ ہدایت کے۔'' ﴿ وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ قُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾ ﴾ (2/البقرہ:58)''اور تم لوگ داخل ہو دروازے میں سجدہ کرنے والوں کی حالت میں اور کہتے ہوئے کہ گناہ معاف ہوں تو ہم بخش دیں گے تمہارے لئے تمہاری خطاؤں کو اور ہم زیادہ دیں گے احسان کرنے والوں کو۔''

نَزِدْ — مضارع مجزوم ہے۔﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ ﴾(42/الشوریٰ:20)''جو ارادہ کرتا ہے آخرت کی کھیتی کا تو ہم اضافہ کرتے ہیں اس کے لئے اس کی کھیتی میں۔''

لَا تَزِدْ — فعل نہی ہے۔تو مت بڑھا۔﴿ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا ضَلٰلًا ﴿۲۴﴾ ﴾(71/نوح:24)''اور تو مت بڑھا ظالموں کو مگر گمراہی میں۔''

زِدْ — فعلی امر ہے۔تو بڑھا۔﴿ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَ رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ؕ ﴿۴﴾ ﴾(73/المزمل:4)''یا آپ ﷺ اضافہ کریں اس پر اور ترتیل سے پڑھیں قرآن کو جیسا کہ ترتیل کا حق ہے۔'' ﴿ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴿۱۱۴﴾ ﴾(20/طٰہٰ:114)''اور آپؐ کہیے اے میرے رب تو بڑھا مجھ کو بلحاظ علم کے۔''

زِيَادَةٌ — اسم ذات ہے۔اضافہ، زیادتی۔﴿ اِنَّمَا النَّسِيْٓءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ ﴾(9/التوبۃ:37)''بیشک مہینے پیچھے کرنا اضافہ ہے کفر میں۔''

مَزِيْدٌ — اسم ذات ہے۔اضافی چیز۔﴿ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَ لَدَيْنَا مَزِيْدٌ ﴿۳۵﴾ ﴾(50/قٓ:35)''ان کے لئے اس میں ہے جو وہ لوگ چاہیں گے اور ہمارے پاس اور بھی چیزیں ہیں۔''

(افتعال) اِزْدِيَادًا — بڑھنا، زیادہ ہونا۔﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ ﴾(3/آل عمران:90)''بیشک جن لوگوں نے ناشکری کی اپنے ایمان کے بعد پھر وہ لوگ زیادہ ہوئے بلحاظ ناشکری کے تو ہرگز قبول نہیں کی جائے گی ان کی توبہ۔''(نوٹ: 'زی د' مادہ جب باب افتعال میں استعمال ہوتا ہے تو افتعال کی 'ت' تبدیل ہو کر 'د' میں بدل جاتی ہے۔اور یہ ایک استثنائی صورت ہے۔باب افتعال کے خصوصی قواعد میں سے ایک قاعدہ یہ ہے کہ باب افتعال کے 'ف' کلمہ پر اگر د، ذ، ز آجائے تو باب کی 'ت' تبدیل ہو کر وہی حرف بن جاتی ہے۔چنانچہ اس قاعدے کے لحاظ سے 'ت' کو 'ز' میں تبدیل ہونا چاہیے تھا لیکن خلاف قاعدہ 'ت'، 'د' میں تبدیل ہو جاتی ہے۔اس قاعدہ کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو آسان عربی گرامر از لطف الرحمٰن خان صاحب۔حصہ سوم، صفحہ ۶۳)

اَللّٰهُ (ء ل ہ): آیت بسم اللہ دیکھیں۔

ع ذ ب

(ض) عَذْبًا — پیاس کی شدت کی وجہ سے کچھ کھانے کے قابل نہ رہنا۔روکنا۔

(س) عَذَبًا — پانی کا کائی دار ہونا۔

(ک) عُذُوْبَةً — پانی کا میٹھا اور خوشگوار ہونا۔(ثلاثی مجرد سے کوئی فعل قرآن مجید میں استعمال نہیں ہوا)۔

عَذْبٌ — صفت ہے۔خوشگوار پانی۔ میٹھا پانی۔﴿ وَ هُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّ هٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۚ ﴾(25/الفرقان:53)''اور وہی ہے جس نے ملائے دو سمندر، یہ خوشگوار شیریں ہے اور یہ نمکین تلخ ہے۔''

عَذَابٌ — اسم ذات ہے۔ ہر وہ چیز جو انسان کو تکلیف دے، مشقت میں ڈالے۔عذاب۔﴿ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّ لَهُمْ فِي

الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾ (2/البقرہ:114) ''ان کے لیے ہے دنیا میں رسوائی اور ان کے لیے ہے آخرت میں عظیم عذاب۔''

(تفعیل) تَعْذِيْبًا کسی کو تکلیف دینا۔عذاب دینا۔﴿وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ؕ﴾(9/التوبہ:106) ''اور کچھ دوسرے لوگ موقوف رکھے گئے اللہ کے فیصلے کے لیے، چاہے وہ عذاب دے ان کو اور یا وہ توبہ قبول کرے ان کی۔''

مُعَذِّبٌ ج: مُعَذِّبُوْنَ۔اسم الفاعل ہے۔ عذاب دینے والا۔ ﴿وَ مَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿۳۳﴾﴾ (8/الانفال:33) ''اور نہیں ہے اللہ ان کو عذاب دینے والا اس حال میں کہ وہ لوگ مغفرت طلب کرتے ہیں۔''

ء ل م

(س) اَلَمًا دکھی ہونا، تکلیف اٹھانا۔﴿وَلَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ وَ تَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ؕ﴾(4/النساء:104) ''اور تم لوگ سستی مت کرو اس قوم یعنی کافروں کی تلاش میں۔اگر تم لوگ تکلیف اٹھاتے ہو تو یقیناً وہ لوگ بھی تکلیف اٹھاتے ہیں جیسے تم لوگ تکلیف اٹھاتے ہو۔اور تم لوگ امید رکھتے ہو اللہ سے جس کی وہ لوگ امید نہیں رکھتے۔''

اَلِيْمٌ فَعِيْلٌ کا وزن ہے۔دردناک، تکلیف دینے والا۔عَذَابٌ اَلِيْمٌ (دردناک عذاب)۔

ك و ن

(ن) كَوْنًا کسی چیز کا اپنا وجود پانا۔کسی نئی بات کے وجود میں آنے کی خبر دینا۔واقع ہونا۔ہو جانا (مصدری معنی)۔ كَانَ فعل ناقص بھی ہے اور فعل تام بھی۔فعل ناقص کی صورت میں جملہ اسمیہ پر داخل ہوتا ہے۔مبتدا حالت رفع میں ہی رہتا ہے جبکہ خبر حالت نصب میں آجاتی ہے۔مبتدا کو اس کا اسم اور خبر کو كَانَ کی خبر کہتے ہیں۔فعل تام کی صورت میں اس کا صرف اسم ہوتا ہے اور خبر نہیں ہوتی۔ایسی صورت میں كَانَ فعل ہوتا ہے اور اسم دراصل اس کا فاعل ہوتا ہے۔فعل اور فاعل مل کر بات مکمل کر دیتے ہیں۔ایسی صورت میں اس کا معنی ہوتا ہے ''موجود ہونا'' یا ''پایا جانا۔''

كَانَ کے معنوی استعمالات: (1) ماضی: كَانَ سے ماضی مراد لیا جاتا ہے۔مثلاً ﴿اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً﴾ ''یقیناً حضرت ابراہیمؑ اپنی ذات میں ایک پوری امّت تھے۔'' کبھی اس سے ماضی بعید مراد لیا جاتا ہے جیسے فرمایا: ﴿كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً﴾ ''ابتدا میں سب لوگ ایک ہی طریقے پر تھے۔'' (یاد کر لیجیے کہ فعل ماضی پر كَانَ داخل کرنے سے بھی ماضی بعید کے معنی پیدا ہوتے ہیں)۔کبھی اس سے ماضی استمراری (یعنی ماضی میں کسی کام کا مسلسل ہوتے رہنا) مراد لیا جاتا ہے۔ایسی صورت میں كَانَ کا مضارع پر داخل ہونا ضروری ہے۔جیسے آیت زیر مطالعہ میں فرمایا:﴿وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ﴾۔ماضی قریب کے لیے بھی كَانَ استعمال ہوتا ہے یہاں تک کہ بات کرتے ہوئے ایک لمحہ پہلے کے وقت کے لیے بھی اس کا استعمال جائز ہے۔جیسے فرمایا﴿كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا﴾ ''ہم کیسے گفتگو کریں اس سے جو (ایک سیکنڈ پہلے) جھولے میں بچہ تھا۔'' کبھی كَانَ ''ماضی غیر منقطع'' کے لیے استعمال ہوتا ہے یعنی ایک چیز جو ماضی میں تھی اس کا وجود یا حیثیت حال میں بھی ویسے ہی ہے۔مثلاً﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ﴾ اس کے معنی ہیں كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ فِيْ عِلْمِ اللّٰهِ یعنی تم اللہ تعالیٰ کے علم میں پہلے ہی سے بہترین

امت تھے اور اب بھی بہترین امت ہو۔

(2) کَانَ کا استعمال جب اللہ تعالیٰ کی صفات کے ساتھ ہو تو اس سے دوام اور ازلیت کے معنی لیے جاتے ہیں یعنی وہ صفت ہمیشہ سے ہے، اب بھی ہے اور ہمیشہ رہے گی بالکل اسی طرح جیسے اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے ہے، اب بھی ہے اور ہمیشہ رہے گا: ﴿وَ کَانَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمًا﴾ ''اللہ تعالیٰ ہر چیز سے ازلاً ابداً خوب واقف ہے۔'' ﴿وَ کَانَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرًا﴾ ''اللہ کی ازلی ابدی قدرت ہر چیز کو محیط ہے۔''

(3) کَانَ کا استعمال جب کسی چیز کی ایسی صفت سے متعلق ہو جو اس میں موجود ہو تو معنی ہوتے ہیں کہ وہ صفت اس چیز کے ساتھ لازم و ملزوم ہے اور بہت ہی کم اس سے جدا ہوتی ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَ کَانَ الۡاِنۡسَانُ کَفُوۡرًا﴾، ﴿وَ کَانَ الۡاِنۡسَانُ قَتُوۡرًا﴾، ﴿وَ کَانَ الۡاِنۡسَانُ اَکۡثَرَ شَیۡءٍ جَدَلًا﴾ ان آیات میں انسان کی جن صفات کا ذکر کیا گیا ہے اِن سے مراد ہے کہ اکثر انسانوں کی یہ لازمی صفات ہیں اور شاذ و نادر ہی ان سے الگ ہوتی ہیں۔ اسی طرح شیطان کے متعلق فرمایا: ﴿وَ کَانَ الشَّیۡطٰنُ لِلۡاِنۡسَانِ خَذُوۡلًا﴾، ﴿وَ کَانَ الشَّیۡطٰنُ لِرَبِّہٖ کَفُوۡرًا﴾ یعنی یہ دونوں صفات خذول اور کفور، شیطان کی لازمی صفات میں سے ہیں۔ اسی طرح باطل کے متعلق فرمایا ﴿اِنَّ الۡبَاطِلَ کَانَ زَہُوۡقًا﴾ یعنی باطل ہمیشہ مٹ جاتا ہے اور کبھی قائم اور دائم نہیں رہتا۔

(4) ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہونے کے لیے بھی کَانَ کا استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً: ﴿وَ کَانَ مِنَ الۡکٰفِرِیۡنَ﴾ اکثر بزرگوں نے اس آیت کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ ابلیس انکار اور تکبر کر کے کافروں میں سے ہو گیا۔ ﴿فَاَتۡبَعَہُ الشَّیۡطٰنُ فَکَانَ مِنَ الۡغٰوِیۡنَ﴾ ''تب پیچھے لگ گیا اس کے شیطان تو وہ ہو گیا گمراہوں میں سے۔'' (واللہ اعلم)

(5) کَانَ کبھی مستقبل کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا: ﴿یَوۡمًا کَانَ شَرُّہٗ مُسۡتَطِیۡرًا﴾ ''وہ دن جس میں شر عمومی ہوگا (یعنی قیامت کا دن)۔'' (تلخیص از مفردات القرآن و لغات القرآن)

کَآئِنٌ اسم الفاعل ہے۔ واحد مذکر۔ ہو جانے والا۔

کَآئِنَۃٌ ج: کَآئِنَاتٌ۔ اسم الفاعل ہے۔ واحد مؤنث۔ ہو جانے والی۔ کائنات سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کے امر کُنۡ کے نتیجے میں ہو جانے والی تمام چیزیں۔

کُنۡ فعل امر ہے۔ تو ہو جا۔ ﴿وَ کُنۡ مِّنَ الشّٰکِرِیۡنَ ﴿۱۴۴﴾﴾ (7/الاعراف:144) ''اور تو ہو جا شکر کرنے والوں میں سے۔''

مَکَانٌ مَفۡعَلٌ کے وزن پر اسم الظرف ہے۔ واقع ہونے کی جگہ۔ پھر مطلقاً جگہ۔ ٹھکانہ وغیرہ کے معانی میں آتا ہے۔ ﴿وَ اِذَا بَدَّلۡنَاۤ اٰیَۃً مَّکَانَ اٰیَۃٍ ۙ﴾ (16/النحل:101) ''اور جب ہم بدلتے ہیں کسی آیت کو کسی آیت کی جگہ۔'' ﴿اُولٰٓئِکَ شَرٌّ مَّکَانًا﴾ (5/المآئدہ:60) ''وہ لوگ زیادہ برے ہیں ٹھکانے کے لحاظ سے۔''

مَکَانَۃٌ مَفۡعَلَۃٌ کا وزن ہے۔ یہ بھی اسم ظرف کا وزن ہے۔ لفظی معنی ہیں مقام، جگہ۔ مجازاً (یعنی کسی لفظ کے غیر حقیقی معنی) اس سے ''حالت'' اور ''طریقہ'' مراد لیا جاتا ہے۔ ﴿قُلۡ یٰقَوۡمِ اعۡمَلُوۡا عَلٰی مَکَانَتِکُمۡ﴾ (6/الانعام:135) ''آپؐ کہہ دیجئے اے میری قوم والو! عمل کرتے رہو اپنے طریقے پر۔'' (ترجمہ ماجدیؒ) ''تو کہہ دے اے لوگو! تم کام کرتے رہو اپنی جگہ پر۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) ''آپؐ فرما دیجئے کہ اے میری قوم تم اپنی حالت پر عمل کرتے رہو۔'' (ترجمہ احسن البیان) یا فرمایا: ﴿وَ قُلۡ لِّلَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ اعۡمَلُوۡا عَلٰی مَکَانَتِکُمۡ ؕ﴾ (11/ھود:121) ''اور آپؐ اُن لوگوں سے کہہ دیجئے جو ایمان نہیں لاتے کہ تم اپنی حالت پر عمل کرتے رہو۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔

مَكِيْنٌ فَعِيْلٌ کے وزن پر صفت مشبہ کا صیغہ ہے کَوْنٌ مصدر سے۔ اس سے بھی مختلف معنی مراد لیے جاتے ہیں مثلاً معزز، مرتبہ والا، مضبوط، محفوظ اور مکان میں رہنے والا۔ ﴿ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝﴾ (23/مومنون:13) ''پھر ہم نے اُسے نطفہ بنایا ایک محفوظ مقام میں۔'' (ترجمہ ماجدیؒ) ﴿ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۝﴾ (81/التکویر:20) ''جو قوت والا ہے عرش والے (اللہ) کے نزدیک بلند مرتبہ ہے۔'' (ترجمہ احسن البیان) ﴿قَالَ اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ ۝﴾ (12/یوسف:54) ''تو اُن سے کہا گیا کہ تم آج سے ہمارے ہاں (ہر طرح) معزز اور معتبر ہو۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)

(استفعال) اِسْتِكَانَةً وجود چاہنا۔ عاجزی کرنا۔ جھک جانا۔ ﴿وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ؕ﴾ (3/آل عمران:146) ''اور نہ وہ کمزور ہوئے اور نہ وہ جھکے۔''

ك ذ ب

(ض) كِذْبًا، كَذِبًا جانتے بوجھتے کسی کو غلط خبر دینا۔ جھوٹ بولنا۔ دل اور زبان کی ہم آہنگی نہ ہونا۔ ﴿وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ ؕ﴾ (39/الزمر:60) ''اور قیامت کے دن تو دیکھے گا ان لوگوں کو جنہوں نے جھوٹ کہا اللہ پر کہ ان کے چہرے کالے ہیں۔'' كِذْبٌ، صِدْقٌ کی ضد ہے۔ کذب (جھوٹ)، قول (بات) میں بھی ہوتا ہے، فعل میں بھی اور عقیدے میں بھی۔ کوئی بات اگر حقیقت کے مطابق نہ ہو تو وہ جھوٹ ہے۔ اسی طرح اس کا استعمال افعال جوارح (جارحہ کی جمع۔ انسان کے ہاتھ پاؤں اور دیگر اعضاء) کے لیے بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ جب کوئی شخص جنگ کا حق ادا کر دے اور جو کچھ اس پر واجب تھا وہ کر دکھائے تو کہا جاتا ہے صَدَقَ فِي الْقِتَالِ یعنی وہ جنگ میں سچا رہا اور اگر اس کے خلاف ہو تو کہا جاتا ہے كَذَبَ فِي الْقِتَالِ وہ جنگ میں جھوٹا رہا یعنی بودا (بزدل، کمزور، پھُس پھُسا) ثابت ہوا۔ اسی طرح کذب کا استعمال ایسی بات کے لیے بھی ہوتا ہے جو بظاہر تو صحیح ہو لیکن عقیدے کے مطابق نہ ہو۔ جیسے فرمایا: ﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ﴾ بے شک منافق جھوٹے ہیں۔ منافق حضورؐ کی نبوت کی زبانی گواہی تو دیتے تھے لیکن چونکہ دل سے آپؐ کو اللہ کا رسول تسلیم نہیں کرتے تھے اسی لیے ان کو جھوٹا کہا گیا۔

كَذِبٌ اسم ذات ہے۔ جھوٹ، جھوٹی بات۔ ﴿وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ﴾ (40/المومن:28) ''اور اگر وہ جھوٹ بولنے والا ہے تو اس پر ہے اس کا جھوٹ۔''

كَاذِبٌ اسم الفاعل ہے۔ جھوٹ بولنے والا، جھوٹا۔ اوپر آیت المومن:28 دیکھیں۔

مَكْذُوْبٌ اسم المفعول ہے بمعنی جھوٹ۔ لفظی معنی ہے جو جھوٹ بولا گیا۔ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ کا معنی ہے جھوٹ کے بغیر۔ ﴿ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ۝﴾ (11/ھود:65) ''یہ وعدہ جھوٹا نہیں ہے۔''

كَذَّابٌ فَعَّالٌ کا وزن ہے۔ اسم المبالغہ۔ بہت زیادہ جھوٹ بولنے والا۔ بہت بڑا جھوٹا۔ ﴿وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۝﴾ (38/صٓ:4) ''اور کہا انکار کرنے والوں نے کہ یہ بڑا جھوٹا جادوگر ہے۔''

(تفعیل) تَكْذِيْبًا، كِذَّابًا كِذَّابًا بھی باب تفعیل میں بطور مصدر استعمال ہوتا ہے۔ جھٹلانا۔ کسی کو جھوٹا قرار دینا چاہے وہ حقیقت میں سچا ہو یا واقعی جھوٹا ہو، دونوں حالتوں میں اس کا استعمال ہوتا ہے البتہ قرآن مجید میں اس کا استعمال اللہ تعالیٰ، اُس کے انبیاء اور اُن کی بتائی ہوئی باتوں اور اللہ تعالیٰ کی آیات کی تکذیب کے لیے یہ استعمال ہوا ہے۔ ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ﴾ (2/البقرہ:39) ''اور جن لوگوں نے انکار کیا اور جھٹلایا ہماری نشانیوں کو، وہ لوگ آگ والے ہیں۔'' ﴿وَّكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا ۝﴾ (78/النباء:28) ''اور ہماری آیتوں کو انہوں نے بالکل جھٹلا دیا۔''

مُكَذِّبٌ ج:مُكَذِّبُوْنَ-اسم الفاعل ہے ۔جھٹلانے والا۔﴿فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿١٣٧﴾﴾ (3/آل عمران:137)''تو سیر کرو زمین کی، پس دیکھو کیسا تھا انجام جھٹلانے والوں کا۔''

ترکیب فِيْ قُلُوْبِهِمْ قائم مقام خبر مقدم ہے،خبر مَوْجُوْدٌ محذوف ہے اور مَرَضٌ مبتداء مؤخرنکرہ ہے۔فَزَادَ میں 'ف' نتیجہ ظاہر کرنے کے لیے ہے اور فعل زَادَ کا مفعول هُمْ کی ضمیر ہے جبکہ مَرَضًا تمیز ہے۔لَهُمْ قائم مقام خبر مقدم ہے،خبر وَاجِبٌ محذوف ہے اور مرکب توصیفی عَذَابٌ اَلِيْمٌ مبتداء مؤخرنکرہ ہے۔بِمَا میں 'ب' سببیہ ہے اور 'ما' موصول ہے۔كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ماضی استمراری ہے اور یہ پورا جملہ صلہ ہے 'ما' کا اور صلہ اور موصول مجرور ہیں 'ب' سببیہ کی وجہ سے اور جار مجرور مل کر متعلق خبر ہیں۔

ترجمہ
البقرۃ:10

فِيْ قُلُوْبِهِمْ	مَّرَضٌ ۙ	فَزَادَ	هُمُ	اللّٰهُ
ان کے دلوں میں	ایک مرض ہے	تو بڑھایا	ان کو	اللہ نے

مَرَضًا ۚ	وَلَهُمْ	عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ	بِمَا	كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ﴿١٠﴾
مرض کے لحاظ سے	اور ان کیلئے	ایک دردناک عذاب ہے	اس سبب سے جو	وہ لوگ جھوٹ کہتے تھے

نوٹ:1 ''حضور کریم ﷺ کے خلاف منافقین کے دل میں عداوت کے جو جذبات پرورش پا رہے تھے اور حسد اور غصہ کی جو چنگاریاں چٹخ رہی تھیں ان کو قرآن نے مرض سے تعبیر فرمایا ہے۔جب وہ حضور کریم ﷺ اور اِسلام کی روز افزوں عزت اور ترقی کو دیکھتے تو حسد وعناد کے شعلے بھڑک اُٹھتے۔ اللہ تعالیٰ اُنہیں تنبیہ فرماتا ہے کہ اگر اُنہوں نے اس مرض کو یونہی بڑھنے دیا اور اِس کا علاج نہ کیا تو جس طرح جسمانی بیماریاں جسمانی موت کا باعث بنتی ہیں اسی طرح ان کا یہ مرض ان کے قلب وروح کا گلا گھونٹ کر رکھ دے گا۔''(ضیاء القرآن، ج۱،ص:۳۵)

نوٹ:2 حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فَزَادَهُمْ میں 'ف' کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:''فَزَادَهُمْ میں حرف 'ف' بہت اہم ہے۔یہ گویا اس کا اعلان ہے کہ آگے جس فعل کا ذکر آ رہا ہے وہ محض بطور ثمرہ یا نتیجہ کے پیدا ہوا ہے۔حق تعالیٰ کی جانب اس قسم کے افعال کا انتساب صرف مجازی حیثیت رکھتا ہے۔یعنی یہ نہیں کہ اللہ نے خواہ مخواہ ان سے یہ افعال کرا چھوڑے۔اس نے تو صرف وہ حالات واسباب پیدا کر دیئے،جن سے ان بدنصیبوں نے اپنے مرض کے بڑھانے کا کام لیا،ورنہ اگر وہ اپنی عقل وارادہ کا صحیح استعمال کرتے تو اِنہیں اسباب وحالات سے ہدایت بھی پا سکتے تھے۔ یہ سزا بھی جو کچھ ملی ٹھیک جرم کے مناسب حال ہی ملی ہے۔اس قسم کے افعال کا حق تعالیٰ کی جانب انتساب،قدیم صحیفوں کا بھی ایک محاورۂ عام ہے۔ ''اسرائیل نے مجھے نہ چاہا تب میں نے انہیں ان کے دلوں کی سرکشی کے بس میں چھوڑ دیا۔''(زبور۸:۱۰،۱۱)''بس خدا نے منہ موڑ کر انہیں چھوڑ دیا کہ آسمانی فوج کو پوجیں''(اعمال۷:۴۲)''خدا نے ان کے دلوں کی خواہشوں کے مطابق اُنہیں ناپاکی میں چھوڑ دیا کہ ان کے بدن آپس میں بے حرمت کیے جائیں۔''(رومیون۱:۲۴)۔(تفسیر ماجدیؒ،ص۔۱۰)۔

اور مولانا امین احسن اصلاحیؒ صاحب فرماتے ہیں:''یہاں حسد کے بڑھانے کے فعل کو اللہ تعالیٰ نے جو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے تو یہ درحقیقت اس سنت کو اس نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے جس کے تحت یہ فعل انجام پاتا ہے۔اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے سینہ کو ایمان و اسلام کی جلوہ گاہ بنانے کے بجائے اس کو بغض وحسد ہی کی پرورش گاہ بنائے رکھنا چاہتا ہے تو اس کے سامنے اسی طرح کے حالات وواقعات ظاہر ہوتے ہیں جو اس کی اسی بس بھری فصل کی آبیاری کرتے ہیں۔یہود کو مسلمانوں پر حسد تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اسلام کی نعمت کیوں دے دی۔نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام اور اس کی برکتوں کی روز افزوں ترقی نے ان کے اس حسد کے اسباب میں اور زیادہ اضافہ کیا اور یہ اضافہ برابر ہوتا ہی رہا یہاں تک کہ اس چیز نے ان کو بالکل تباہ کر کے چھوڑا۔(تدبر قرآن، ج۱،ص۔۱۱۹)

آیت:11- 12

﴿وَ اِذَا قِیۡلَ لَهُمۡ لَا تُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ ۙ قَالُوۡۤا اِنَّمَا نَحۡنُ مُصۡلِحُوۡنَ ﴿۱۱﴾ اَلَاۤ اِنَّهُمۡ هُمُ الۡمُفۡسِدُوۡنَ وَ لٰکِنۡ لَّا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿۱۲﴾﴾

اِذَا

یہ ظرف زمان ہے یعنی اس میں کام کرنے یا ہونے کے ''وقت'' کا مفہوم ہوتا ہے۔ عام طور پر اس کا ترجمہ ''جب، جب کبھی بھی، اس وقت، اچانک، ناگہاں'' سے کیا جاتا ہے۔ اِذَا کے ترجمے میں عموماً مستقبل کا مفہوم ہوتا ہے خواہ وہ ماضی پر آیا ہو جیسے فرمایا: ﴿اِذَا السَّمَآءُ انۡشَقَّتۡ﴾ ''جب آسمان پھٹ جائے گا''۔ قسم کے بعد آئے تو حال کے لیے بھی آتا ہے جیسے فرمایا: ﴿وَالنَّجۡمِ اِذَا هَوٰی﴾ ''اور قسم ہے ستارے کی جب وہ گرنے لگے''۔ اِذَا میں شرط کا مفہوم بھی ہوتا ہے۔ اِذَا شرطیہ کے بعد ہمیشہ فعل آتا ہے۔ اِذَا بعض دفعہ مفاجات یعنی کسی چیز کے اچانک پیش آنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اس وقت اس کے بعد اسم کا آنا ضروری ہوتا ہے۔ اسے اِذَا اَلۡفُجَائِیَّۃُ کہتے ہیں۔ جیسے فرمایا: ﴿فَاِذَا هِیَ حَیَّۃٌ تَسۡعٰی﴾ ''پس اچانک وہ دوڑتا ہوا سانپ بن گیا''۔

قِیۡلَ اور قَالُوۡا (ق و ل): البقرۃ آیت 8 دیکھیں۔

ف س د

(ن۔ض) **فَسَادًا**: کسی چیز کا نظم بگڑ جانا، کسی چیز کا حد اعتدال سے تجاوز کر جانا، خراب ہونا۔ یہ صَلَاحٌ کی ضد ہے۔ ﴿وَ لَوۡ لَا دَفۡعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعۡضَهُمۡ بِبَعۡضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الۡاَرۡضُ﴾ (2/البقرۃ:251) ''اور اگر نہ ہوتا اللہ کا دفع کرنا لوگوں کو، ان کے بعض کو بعض سے، تو زمین بگڑ جاتی یعنی اجتماعی نظام کا توازن بگڑ جاتا''۔

فَسَادٌ: اسم ذات ہے۔ نظم کی خرابی یا بگاڑ۔ ﴿ظَهَرَ الۡفَسَادُ فِی الۡبَرِّ وَ الۡبَحۡرِ بِمَا کَسَبَتۡ اَیۡدِی النَّاسِ﴾ (30/الروم:41) ''ظاہر ہوئی نظم کی خرابی خشکی اور تری میں بسبب اس کے جو کمایا لوگوں کے ہاتھوں نے''۔

(افعال) **اِفۡسَادًا**: کسی چیز کا نظم بگاڑنا، کسی چیز کا توازن بگاڑنا، خراب کرنا۔ ﴿وَ قَالَ الۡمَلَاُ مِنۡ قَوۡمِ فِرۡعَوۡنَ اَتَذَرُ مُوۡسٰی وَ قَوۡمَهٗ لِیُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ﴾ (7/الاعراف:127) ''اور کہا سرداروں نے فرعون کی قوم میں سے، کیا تو چھوڑتا ہے موسیٰؑ اور ان کی قوم کو تاکہ وہ لوگ فساد مچائیں زمین میں''۔

مُفۡسِدٌ: ج: مُفۡسِدُوۡنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ نظم بگاڑنے والا۔ ﴿اِنَّ یَاۡجُوۡجَ وَ مَاۡجُوۡجَ مُفۡسِدُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ﴾ (18/الکھف:94) ''بیشک یاجوج اور ماجوج نظام بگاڑنے والے ہیں زمین میں''۔

ء ر ض

(ن) **اَرۡضًا**: کسی جگہ کا سرسبز اور خوش منظر ہونا۔

اَلۡاَرۡضُ: اسم ذات ہے۔ زمین۔ ''ارض ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جو انسان کے قدموں کے نیچے ہو'' (ماجدیؒ)

اِنَّمَا

اِنَّمَا ایک لفظ ہے اس میں اِنَّ حرف مشبہ بالفعل ہے اور 'ما' کافّہ ہے۔ جو اِنَّ کے عمل کو روک دیتا ہے۔ یہ حصر کا مفہوم دیتا ہے اور اس کے معنی ہیں۔ ''کچھ نہیں سوائے اس کے کہ'' یا ''بات اتنی ہے بس کہ'' اسی طرح اَنَّمَا ہے یعنی اَنَّ حرف مشبہ بالفعل اور 'ما' کافّہ جو اَنَّ کے عمل کو روک دیتا ہے۔ اب ایک اہم بات نوٹ کریں اِنَّ اور مَا (یعنی اِنَّ مَا) دو لفظ ہیں۔ اس میں 'ما' موصولہ ہے اور اِنَّ کا اسم ہے۔ اس کے معنی ہیں ''بے شک وہ جو کہ'' قرآن مجید

میں کہیں کہیں اِنَّ مَا کو ''اِنَّمَا'' بھی لکھا گیا ہے لیکن عبارت میں فرق صاف پتہ چل جاتا ہے۔ مثلاً: ﴿ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ﴾ (المرسلات:7) ''جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ ضرور واقع ہونے والی ہے۔'' یہاں 'مَا' موصولہ ہے اور اِنَّ کا اسم ہے۔ اسی طرح اَنَّ مَا کو بھی اکٹھا ''اَنَّمَا'' لکھا گیا ہے۔ مثلاً: ﴿ وَ لَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِیْ لَهُمْ خَیْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ﴾ (آل عمران:178) ''اور جو لوگ کفر کر رہے ہیں وہ یہ خیال نہ کریں کہ ہم جو اُنہیں مہلت دے رہے ہیں یہ اُن کے حق میں بہتر ہے۔'' یہاں بھی مَا کو موصولہ یا مصدریہ مانا گیا ہے۔ یا فرمایا: ﴿ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ ﴾ (الانفال:41) ''اور جان لو کہ جو غنیمت بھی تم حاصل کرو۔'' یہاں بھی 'مَا' اسم موصول ہے اور اَنَّ کا اسم ہے۔ (واللہ اعلم)

ص ل ح

(ف) **صَلَاحًا** نظم کا ٹھیک ہونا، درست ہونا، نیک ہونا۔ صلاح کا لفظ کبھی فساد کے مقابلے میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی سَیِّئَۃٌ (برائی) کے مقابلے میں۔ ﴿ جَنّٰتُ عَدْنٍ یَّدْخُلُوْنَهَا وَ مَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآىِٕهِمْ وَ اَزْوَاجِهِمْ وَ ذُرِّیّٰتِهِمْ ﴾ (13/الرعد:23) ''عدن کے باغات، وہ لوگ داخل ہوں گے اس میں اور ان کے باپ دادوں اور بیویوں اور ان اولادوں میں سے بھی جو نیکوکار ہوں گے۔''

صَالِحٌ ج: صَالِحُوْنَ- اسم الفاعل ہے۔ نیک، اچھا، بھلا، اللہ تعالیٰ کے ایک پیغمبر کا نام جو قوم ثمود کی طرف بھیجے گئے تھے۔ مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں: ''صالح سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے خیالات اور عقائد میں، اپنی نیت اور ارادوں میں اور اپنے اقوال و افعال میں راہِ راست پر قائم ہو اور فی الجملہ اپنی زندگی میں نیک رویہ رکھتا ہو۔'' ﴿ فَمَنْ کَانَ یَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْیَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا ﴾ (18/الکہف:110) ''پس جو امید رکھتا ہے اپنے رب سے ملاقات کی، تو اسے چاہیے کہ وہ نیک عمل کرے۔'' ﴿ وَ اِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ﴾ (7/الاعراف:73) ''اور ثمود کی طرف ہم نے اُن کے بھائی صالحؑ کو بھیجا۔''

صَالِحَةٌ ج: صَالِحَاتٌ۔ صَالِحٌ کا مونث۔ قرآن مجید میں صرف صَالِحَاتٌ استعمال ہوا ہے۔ یعنی نیکیاں، اچھے کام، نیک عورتیں۔ مولانا عبدالرشید نعمانیؒ فرماتے ہیں: ''قرآن مجید میں صرف ایک مقام پر لفظ صَالِحَاتٌ نیک عورتوں کے لیے استعمال ہوا ہے ارشاد ہے ﴿ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ ﴾ ''پھر جو عورتیں نیک ہیں سو تابعدار ہیں۔'' اور باقی سب جگہ پر نیکیوں کے لیے آیا ہے۔ (لغات القرآن، ج ۴، ص ۱۳)

صُلْحٌ صلح۔ امام راغبؒ فرماتے ہیں: ''اَلصُّلْحُ کا لفظ خاص کر لوگوں سے باہمی نفرت کو دور کر کے امن و سلامتی پیدا کرنے پر بولا جاتا ہے چنانچہ اِصْطَلَحُوْا وَ تَصَالَحُوْا کے معنی باہم امن و سلامتی سے رہنے کے ہیں قرآن میں ہے: ﴿ اَنْ یُّصْلِحَا بَیْنَهُمَا صُلْحًا ؕ وَ الصُّلْحُ خَیْرٌ ؕ ﴾ (4/النساء:128) ''کہ آپس میں کسی قرارداد پر صلح کر لیں اور صلح ہی بہتر ہے۔'' (مفردات القرآن، ج ۲، ص ۵۹۰)

(افعال) **اِصْلَاحًا** نظم کو درست کرنا، نظم کی خرابی کو دور کرنا، اصلاح کرنا، صلح کرانا، نیک ہونا، سنورنا۔ ﴿ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَ اَصْلَحُوْا ۚ ﴾ (24/النور:5) ''سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے توبہ کی اس کے بعد، اور (اپنی) اصلاح کی۔'' ﴿ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَصْلَحَ ﴾ (6/الانعام:54) ''پھر اُس کے بعد توبہ کر لے اور نیک ہو جائے۔'' امام راغبؒ فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ کے کسی بندے کی اصلاح کرنا کے کبھی تو یہ معنی ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے فطرۃً صالح بنایا اور کبھی اس کے معنی اس سے خرابی اور نقص کو دور کرنے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے: ﴿ وَ اَصْلَحَ بَالَهُمْ ﴾ ''اور ان کی حالت

سنوار دی۔" ﴿ يُّصۡلِحۡ لَكُمۡ اَعۡمَالَكُمۡ ﴾ "وہ تمہارے لیے تمہارے اعمال درست کر دے گا" ﴿ وَ اَصۡلِحۡ لِيۡ فِيۡ ذُرِّيَّتِيۡ ﴾ "اور میرے لیے میری اولاد میں صلاح پیدا کر" اور آیت کریمہ: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصۡلِحُ عَمَلَ الۡمُفۡسِدِيۡنَ ﴾ "بے شک اللہ تعالیٰ شریروں کے کام سنوارا نہیں کرتا"، کے معنی یہ ہیں کہ مفسد لوگ چونکہ عملی طور پر اللہ تعالیٰ کی مخالفت کر کے خرابیاں پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس کے برعکس ذات باری تعالیٰ ہر کام میں اصلاح کو پسند کرتی ہے۔ لہٰذا یہ ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کے اعمال کو درست قرار دے۔" (مفردات القرآن، ج ۲، ص ۵۹۰)

مُصۡلِحٌ ج: مُصۡلِحُوۡنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ نظم کی خرابی دور کرنے والا۔ اصلاح کرنے والا۔ نیک۔ ﴿ وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهۡلِكَ الۡقُرٰى بِظُلۡمٍ وَّ اَهۡلُهَا مُصۡلِحُوۡنَ ﴿١١٧﴾ ﴾ (11/ھود:117) "اور نہیں ہے تیرا رب کہ وہ ہلاک کرے بستیوں کو ظلم کے ساتھ، اس حال میں کہ ان کے لوگ اصلاح کرنے والے ہوں۔"

اَلَا یہ حروف تنبیہ میں سے ہے۔ یہ وہ حروف ہیں جن کے ذریعے سے کسی کو خبردار کیا جاتا ہے۔ عام طور پر اس کا ترجمہ "خبردار ہو جاؤ" "آگاہ ہو جاؤ" "سنو" اور "جان لو" سے کیا جاتا ہے۔ اَلَا تخصیص کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے حروف تخصیص وہ ہوتے ہیں جن سے کسی کو ترغیب دلائی جائے اور کسی کام پر آمادہ کیا جائے۔ اس صورت میں اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے "کیوں نہیں" اور یہ ہمیشہ فعل کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ اَلَا، استفتاح یعنی کلام کے شروع کرنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ کبھی حرف استفہام "اَ" اور "لَا" نافیہ ساتھ آتے ہیں تب بھی اَلَا ہی بنتا ہے۔ جس کے معنی ہوتے ہیں "کیا نہیں"۔ اِن دونوں میں فرق عبارت کے مفہوم سے کیا جاتا ہے۔ مثلاً: ﴿ اَلَا يَتَّقُوۡنَ ﴾ (الشعراء:11) "کیا وہ پرہیزگاری نہ کریں گے۔" یا فرمایا ﴿ اَلَا تَسۡتَمِعُوۡنَ ﴾ (الشعراء:25) کیا تم سن نہیں رہے۔" یا فرمایا: ﴿ اَلَا تُحِبُّوۡنَ اَنۡ يَّغۡفِرَ اللّٰهُ لَكُمۡ ﴾ (النور:22) "کیا تم پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمہارے قصور معاف کر دے۔" (واللہ اعلم)

لٰكِنۡ اور لٰكِنَّ لٰكِنَّ حروف مشبہ بالفعل سے ہے۔ لٰكِنۡ اور لٰكِنَّ کے معنی میں کوئی فرق نہیں ہے اور دونوں کے معنی ہیں "لیکن"۔ البتہ ان کے استعمال میں فرق ہے۔ لٰكِنۡ اسم اور فعل دونوں پر آتا ہے اور غیر عامل ہے یعنی یہ اپنے اسم یا فعل مضارع میں کوئی اعرابی تبدیلی نہیں لاتا۔ جبکہ لٰكِنَّ فعل پر نہیں آتا بلکہ صرف اسم پر آتا ہے اور یہ اپنے اسم کو نصب دیتا ہے۔

يَشۡعُرُوۡنَ (ش ع ر): البقرۃ آیت 9 دیکھیں۔

ترکیب 'وَ' استئنافیہ ہے۔ اِذَا ظرف زمان اور شرطیہ ہے۔ قِيۡلَ ماضی مجہول ہے اور لَهُمۡ جار مجرور مل کر اس کا نائب الفاعل ہے۔ لَا تُفۡسِدُوۡا فعل نہی ہے اور فِي الۡاَرۡضِ اس کا متعلق فعل ہے۔ قَالُوۡا فعل وفاعل اور یہ جملہ جواب شرط ہے۔ نَحۡنُ مبتداء ہے اور اسم الفاعل مُصۡلِحُوۡنَ اس کی خبر ہے۔ اَلَا حرف تنبیہ ہے۔ اِنَّهُمۡ میں هُمۡ کی ضمیر اِنَّ کا اسم ہے۔ اس کی خبر اَلۡمُفۡسِدُوۡنَ معرف باللام ہے اس لئے درمیان میں ضمیر فاصل هُمۡ لائی گئی ہے۔ لٰكِنۡ مخفف ہے لٰكِنَّ سے اور غیر عامل ہے۔ لَا يَشۡعُرُوۡنَ مضارع منفی ہے۔

ترجمہ
البقرۃ: 11-12

وَاِذَا قِيۡلَ	لَهُمۡ	لَا تُفۡسِدُوۡا	فِي الۡاَرۡضِ
اور جب بھی کہا جاتا ہے	ان لوگوں سے	تم لوگ فساد مت پھیلاؤ	زمین میں

قَالُوۡٓا	اِنَّمَا نَحۡنُ	مُصۡلِحُوۡنَ ﴿١١﴾	اَلَآ
وہ لوگ کہتے ہیں	ہم تو بس	اصلاح کرنے والے ہیں	آگاہ ہو جاؤ

اِنَّهُمۡ	هُمُ الۡمُفۡسِدُوۡنَ	وَلٰكِنۡ	لَّا يَشۡعُرُوۡنَ ﴿١٢﴾
بے شک وہ لوگ	ہی فساد پھیلانے والے ہیں	اور لیکن	وہ لوگ سمجھتے نہیں

نوٹ: **فساد فی الارض:** حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں: ''اس سے معلوم ہوا کہ قانون شریعت کے علاوہ کسی دین جاہلی پر قائم رہنا، اس کے طور طریقوں کی اشاعت کرنا فساد فی الارض کے مرادف ہے۔ امن عالم ونظام اقوام قائم جب ہی رہ سکتا ہے جب عملدار آمد قانون شریعت پر رہے۔ اس راہ سے انحراف، بلکہ سرمو تجاوز کرنا بھی دنیا کو بدنظمی، ابتری، کشت وخون اور ہر قسم کی طبقاتی جنگ وکشمکش کو دعوت دینا ہے۔ چنانچہ دنیا عملاً اس کا تجربہ بارہا کر چکی ہے، اور اس وقت بھی کر رہی ہے۔ اسلام کے اس پہلو پر کہ وہ نظام عالم کا بہترین ضامن ہے، اللہ مراتب میں اضافہ کرے، ہمارے زمانہ میں اقبال نے شاعرانہ زبان میں خوب ہی لکھ دیا ہے۔'' (تفسیر ماجدیؒ، ص ۱۱)

حضرت مولانا امین احسن اصلاحیؒ فرماتے ہیں: ''فساد فی الارض قرآن مجید کی ایک اصطلاح ہے جس کا مفہوم اس نظام حق کو بگاڑنا یا اس کو بگاڑنے کی کوشش کرنا ہے جو اللہ واحد کی عبادت اور اس کے احکام وقوانین کی اطاعت پر مبنی ہوتا ہے اور جس کی دعوت انبیائے کرامؑ لے کر آتے ہیں۔ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ جس طرح اس کائنات کا نظام تکوینی اس وجہ سے قائم ہے کہ اس کے اندر ایک ہی رب قدیر وقہار کا ارادہ کارفرما ہے، اگر اس کے اندر کسی اور کا زور واختیار بھی چلتا ہوتا تو یہ آن کے آن میں درہم برہم ہو کے رہ جاتا اسی طرح اس کے نظام تشریعی کے اندر اگر کسی اور کی عبادت واطاعت کے جواز یا دخل کو تسلیم کر لیا جائے تو اس سے اس کا مزاج بالکل ہی بگڑ کے رہ جاتا ہے اور یہ بگاڑ سارے نظام تمدن کو خراب کر کے رکھ دیتا ہے۔ اس وجہ سے ہر وہ کوشش قرآن کے نزدیک فساد فی الارض کے حکم میں داخل ہے جو اس بگاڑ کا دروازہ کھولے اگرچہ یہ کوشش بظاہر اصلاح کے نیک ارادہ ہی کے ساتھ کیوں نہ کی جائے۔'' (تدبر قرآن، ج ۱، ص ۱۱۹)

آیت :13

﴿ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ۭ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝۱۳ ﴾

اِذَا: البقرۃ آیت 11 دیکھیں۔ قِيْلَ اور قَالُوْا (ق و ل): البقرۃ آیت 8 دیکھیں۔
اٰمِنُوْا (ء م ن) اور دوسرے متعلقہ صیغوں کے لیے: البقرۃ آیت 3 دیکھیں۔

كَمَا مرکب ہے۔ ک تشبیہ وجر ہوتا ہے اور 'ما' کو موصول یا مصدریہ مانا جاتا ہے۔ 'ما' موصول ہونے کی صورت میں اگلا جملہ صلہ ہوتا ہے اور صلہ اور موصول مل کر محلاً حالت جر میں ہوتے ہیں۔ 'ما' مصدریہ ہونے کی صورت میں 'ما' اگلے فعل کے ساتھ مل کر مصدری معنی پیدا کر دیتا ہے اور محلاً حالت جر میں ہوتا ہے۔ کَمَا سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ مخاطب کو کسی کام کے کرنے پر آمادہ کیا جائے۔

اَلنَّاسُ: البقرۃ آیت 8 دیکھیں۔

س ف ہ

(س) سَفَاهَةً ، سَفَهًا جسم کا ہلکا ہونا، بے وقوف ہونا، احمق ہونا، پست اخلاق والا ہونا۔ ﴿ وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ۭ ﴾ (2/البقرہ:130) ''اور کون منہ پھیرتا ہے ابراہیمؑ کے دین سے مگر وہ جو بے وقوف ہوا بلحاظ اپنے نفس کے۔''

سَفَاهَةٌ اسم ذات ہے۔ بے وقوفی، حماقت، بے عقلی۔ ﴿ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ ﴾ (7/الاعراف:66) ''بیشک ہم خیال کرتے ہیں تم کو بے وقوفی میں۔''

سَفِيْهٌ ج: سُفَهَاءُ ۔ فَعِيْلٌ کے وزن پر صفت ہے۔ بے وقوف، کم عقل، جسے اپنے نفع ونقصان کی پوری تمیز نہ ہو۔ ﴿ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا ﴾ (2/البقرہ:282) ''پس اگر جس پر حق ہے وہ بے وقوف ہو یا ضعیف ہو۔''

﴿ سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ ﴾ (2/البقرہ:142) ''کہیں گے لوگوں میں سے بے وقوف لوگ، کس چیز نے پھیر دیا ان لوگوں کو ان کے قبلہ سے۔''

اَلَآ: البقرۃ آیت 12 دیکھیں۔ لٰكِنْ: البقرۃ آیت 12 دیکھیں۔ يَعْلَمُوْنَ (ع ل م): الفاتحہ آیت 1 دیکھیں۔

ترکیب 'وٗ' عطف کا ہے۔ اِذَا ظرف زمان اور شرطیہ ہے۔ قِيْلَ، ماضی مجہول ہے۔ اور لَهُمْ جار مجرور مل کر اس کا نائب الفاعل ہے۔ اٰمِنُوْا فعل امر ہے اور اس کا فاعل اس میں شامل ضمیر (اَنْتُمْ) ہے۔ كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ متعلق فعل ہے اور اٰمَنَ کا فاعل النَّاسُ ہے۔ اَلنَّاسُ پر 'ال' عہد خارجی ہے یعنی ایسے لوگوں کی بات ہو رہی ہے جو کہنے اور سننے والے کے ذہنوں میں موجود ہیں۔ یعنی صحابہؓ۔ اگلا جملہ قَالُوْا..... السُّفَهَآءُ تک جواب شرط ہے۔ اَنُؤْمِنُ میں اَ استفہامیہ ہے اور نُؤْمِنُ کا فاعل اس میں شامل ضمیر ہے اور كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ متعلق فعل ہے۔ اَلسُّفَهَآءُ فاعل ہے اٰمَنَ کا اور اِس پر بھی 'ال' عہد خارجی ہے۔ یہاں بھی صحابہؓ ہی مراد ہیں۔ یعنی کفار صحابہؓ کو بے وقوف کہتے تھے (معاذ اللہ)۔ اَلَآ حرف تنبیہ ہے۔ اِنَّهُمْ میں هُمْ، اِنَّ کا اسم ہے اور اس کے بعد والا هُمْ ضمیر فاصل ہے، کیونکہ اِنَّ کی خبر اَلسُّفَهَآءُ معرف باللام ہے۔ لٰكِنْ مخفف ہے لٰكِنَّ سے اور غیر عامل ہے، آگے لَا يَعْلَمُوْنَ، مضارع منفی ہے۔

ترجمہ				
البقرۃ:13	وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ	اٰمِنُوْا	كَمَآ	اٰمَنَ النَّاسُ
	اور جب بھی کہا جاتا ہے ان لوگوں سے	تم لوگ ایمان لاؤ	جیسا کہ	ایمان لائے یہ لوگ (یعنی صحابہؓ)

قَالُوْٓا	اَنُؤْمِنُ	كَمَآ	اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ
وہ لوگ کہتے ہیں	کیا ہم ایمان لائیں	جیسے کہ	ایمان لائے یہ بیوقوف لوگ

اَلَآ	اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ	وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳﴾
آگاہ ہو جاؤ!	یقیناً وہ لوگ ہی بیوقوف ہیں	اور لیکن وہ جانتے نہیں ہیں

نوٹ:1 قَالُوْا فعل ماضی ہے۔ لیکن چونکہ بات اِذَا سے شروع ہوئی ہے۔ اس لئے قِيْلَ کی طرح قَالُوْا کا ترجمہ بھی حال میں کیا گیا ہے۔

نوٹ:2 حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ آیت کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''چھٹی آیت میں (یعنی آیت زیر مطالعہ میں) منافقین کے سامنے صحیح ایمان کا ایک معیار رکھا گیا کہ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ ''یعنی ایمان لاؤ جیسے ایمان لائے اور لوگ'' اس میں لفظ ''ناس'' سے مراد باتفاق مفسرین صحابہ کرامؓ ہیں، کیونکہ وہی حضرات ہیں جو نزولِ قرآن کے وقت ایمان لائے تھے، کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف وہی ایمان معتبر ہے جو صحابہ کرامؓ کے ایمان کی طرح ہو، جن چیزوں میں جس کیفیت کے ساتھ ان کا ایمان ہے اسی طرح کا ایمان دوسروں کا ہوگا تو ایمان کہا جائے گا، ورنہ نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرامؓ کا ایمان ایک کسوٹی ہے، جس پر باقی ساری امت کے ایمان کو پرکھا جائے گا، جو اس کسوٹی پر صحیح نہ ہو اس کو شرعاً ایمان اور ایسا کرنے والے کو مومن نہ کہا جائے گا، اس کے خلاف کوئی عقیدہ اور عمل خواہ ظاہر میں کتنا ہی اچھا نظر آئے اور کتنی ہی نیک نیتی سے کیا جائے اللہ کے نزدیک ایمان معتبر نہیں، ان لوگوں نے صحابہ کرامؓ کو سفہاء یعنی بیوقوف کہا، اور یہی ہر زمانے کے گمراہوں کا طریقہ رہا ہے، کہ جو اُن کو صحیح راہ بتلائے اس کو بیوقوف جاہل قرار دیتے ہیں، مگر قرآن کریم نے بتلا دیا کہ درحقیقت وہ خود ہی بیوقوف ہیں کہ ایسی کھلی نشانیوں پر ایمان نہیں رکھتے۔'' (معارف القرآن، ج ۱، ص: ۱۲۵)

آیت:14

﴿وَ اِذَا لَقُوا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا قَالُوۡۤا اٰمَنَّا ۚۖ وَ اِذَا خَلَوۡا اِلٰی شَیٰطِیۡنِہِمۡ ۙ قَالُوۡۤا اِنَّا مَعَکُمۡ ۙ اِنَّمَا نَحۡنُ مُسۡتَہۡزِءُوۡنَ ﴿۱۴﴾﴾

اِذَا: البقرۃ آیت 11 دیکھیں۔

ل ق ی

(س) لِقَاءً کسی کے سامنے آنا، ملنا، کسی کو پالینا، کسی چیز کا حس اور بصیرت سے ادراک کر لینا۔﴿وَ اِذَا لَقُوۡکُمۡ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا ۚۖ وَ اِذَا خَلَوۡا عَضُّوۡا عَلَیۡکُمُ الۡاَنَامِلَ مِنَ الۡغَیۡظِ ؕ﴾(3/آل عمران:119)''اور جب بھی تمہارے سامنے آتے ہیں کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور جب تنہا ہوتے ہیں تو انگلیاں چباتے ہیں تم پر غصہ سے۔''﴿اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ وَ اتَّبَعُوا الشَّہَوٰتِ فَسَوۡفَ یَلۡقَوۡنَ غَیًّا ﴿۵۹﴾﴾(19/مریم:59)''ان لوگوں نے ضائع کیا نماز کو اور پیروی کی خواہشات کی تو عنقریب وہ ملیں گے گمراہی سے۔''﴿بَلۡ ہُمۡ بِلِقَآیِٔ رَبِّہِمۡ کٰفِرُوۡنَ ﴿۱۰﴾﴾(32/السجدہ:10)''بلکہ وہ لوگ اپنے رب سے ملنے کا انکار کرنے والے ہیں۔''

یَلۡقَ مضارع مجزوم ہے۔﴿وَ مَنۡ یَّفۡعَلۡ ذٰلِکَ یَلۡقَ اَثَامًا ﴿۶۸﴾﴾(25/الفرقان:68)''اور جو یہ کرے گا تو وہ ملے گا عذاب سے۔''

لَاقٍ اسم الفاعل ہے۔ ملنے والا۔﴿اَفَمَنۡ وَّعَدۡنٰہُ وَعۡدًا حَسَنًا فَہُوَ لَاقِیۡہِ﴾(28/القصص:61)''تو کیا وہ جس سے وعدہ کیا ہم نے، ایک اچھا وعدہ، اور وہ ملنے والا ہے اس سے۔''

(افعال) اِلۡقَاءً کسی کو کسی کے سامنے کرنا۔ کسی چیز کو اس طرح ڈالنا کہ وہ دوسرے کو سامنے سے نظر آئے۔ زمین پر پھینکنا۔﴿وَ لَا تَقُوۡلُوۡا لِمَنۡ اَلۡقٰۤی اِلَیۡکُمُ السَّلٰمَ لَسۡتَ مُؤۡمِنًا ۚ﴾(4/النساء:94)''اور تم لوگ مت کہو اس سے جس نے ڈالا تمہاری طرف سلام یعنی سلام کیا کہ تو مومن نہیں ہے۔''﴿قَالَ اَلۡقُوۡا ؕ فَلَمَّاۤ اَلۡقَوۡا سَحَرُوۡۤا اَعۡیُنَ النَّاسِ﴾(7/الاعراف:116)''موسیٰؑ نے کہا تم لوگ ڈالو۔ پس جب ان لوگوں نے ڈالا تو انہوں نے جادو کیا لوگوں کی آنکھوں پر۔''﴿سَنُلۡقِیۡ فِیۡ قُلُوۡبِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوا الرُّعۡبَ﴾(3/آل عمران:151)''ہم ڈال دیں گے ان کے دلوں میں جنہوں نے کفر کیا رعب کو۔''﴿وَ مَا کُنۡتَ لَدَیۡہِمۡ اِذۡ یُلۡقُوۡنَ اَقۡلَامَہُمۡ﴾(3/آل عمران:44)''اور آپ ﷺ ان کے پاس نہیں تھے جس وقت وہ لوگ ڈال رہے تھے اپنے قلم یعنی قلم کے ذریعہ قرعہ نکال رہے تھے۔'' اس میں یُلۡقُوۡنَ مضارع ہے لیکن اِذۡ کی وجہ سے ماضی میں ترجمہ ہوگا۔

اَلۡقٰی اِلٰی ــــ قَوۡلًا کا مطلب ہے کسی سے بات کرنا جیسے فرمایا:﴿فَاَلۡقَوۡا اِلَیۡہِمُ الۡقَوۡلَ﴾(16/النحل:86)''تو وہ اُن سے کہیں گے۔''

اَلۡقٰی اِلٰی ــــ سَلَمًا کا مطلب ہے کسی کے سامنے عاجزی ظاہر کرنا، اطاعت کا اقرار کرنا۔ جیسے فرمایا:﴿وَ اَلۡقَوۡا اِلَی اللّٰہِ یَوۡمَئِذِ ۨ السَّلَمَ﴾(16/النحل:87)''اور آ پڑیں اللہ کے آگے اُس دن عاجز ہو کر۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)

اَلۡقٰی اِلٰی ــــ مَوَدَّۃً کا مطلب ہے کسی سے دوستی بڑھانا۔ جیسے فرمایا:﴿تُلۡقُوۡنَ اِلَیۡہِمۡ بِالۡمَوَدَّۃِ﴾(60/الممتحنۃ:1) ''تم اُن کو دوستی کا پیغام بھیجتے ہو۔''

اُلْقِيَ ماضی مجہول ہے۔ ﴿ فَلَوْ لَآ اُلْقِيَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ ﴾ (43/الزخرف:53) ''تو کیوں نہیں ڈالے گئے انؑ پر کنگن سونے کے۔''

اَلْقِ فعل امر ہے۔تو ڈال۔﴿وَاَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ﴾(20/طٰہٰ:69)''اور تو ڈال جو تیرے داہنے ہاتھ میں ہے۔''۔اس کی جمع اَلْقُوْا آتی ہے۔اوپر دیکھیں الاعراف:116۔

فَلْيُلْقِ فعل امر غائب ہے۔چاہیے کہ وہ ڈالے۔﴿ اَنِ اقْذِفِيْهِ فِي التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ ﴾ (20/طٰہٰ:39)''کہ تو (یعنی موسیٰؑ کی والدہ) رکھ دے انؑ کو تابوت میں، پھر تو رکھ دے اس کو دریا میں، پھر دریا کو چاہیے کہ وہ ڈال دے اس کو ساحل پر۔''نوٹ کرلیں کہ فَلْيُلْقِ میں لام امر ساکن ہوگیا ہے۔جبکہ لام گیٔ ساکن نہیں ہوتا۔

مُلْقٍ ج: مُلْقُوْنَ، مُلْقِيْنَ-اسم الفاعل ہے۔ڈالنے والا۔ ﴿ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴾ (26/الشعراء:43)''کہا ان سے موسیٰؑ نے کہ تم لوگ ڈالو جو تم ڈالنے والے ہو۔''

مُلْقِيَةٌ ج: مُلْقِيَاتٌ۔ مُلْقٍ کی مؤنث ہے۔ڈالنے والی۔﴿ فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا ﴾ (77/المرسلت:5)''پھر (دلوں میں خدا کی) یاد ڈالتی ہیں۔''(ترجمہ تفہیم القرآن)

(تفعیل) تَلْقِيَةً کسی کے سامنے پھینکنا۔دینا۔اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال ہو تو معنی ہوتے ہیں کسی کو وحی کرنا اور عطا کرنا۔﴿ فَوَقٰىهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَ لَقّٰىهُمْ نَضْرَةً وَّ سُرُوْرًا ﴾ (76/الدھر:11)''تو بچایا ان کو اللہ نے اس دن کے شر سے اور عطا کی ان کو تازگی اور سرور۔''

يُلَقّٰى مضارع مجہول ہے۔﴿ وَ مَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴾ (41/حٰمٓ السجدہ:35)''اور نہیں دی جاتی (یہ صفت) مگر بڑے نصیبے والوں کو۔''

(مفاعلہ) مُلَاقَاةً اور لِقَاءً ایک دوسرے کے سامنے آنا۔ایک دوسرے سے ملنا۔ملاقات کرنا۔﴿ فَذَرْهُمْ حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ فِيْهِ يُصْعَقُوْنَ ﴾ (52/الطور:45)''تو آپؐ چھوڑ دیں ان کو یہاں تک کہ وہ لوگ ملاقات کریں اپنے اس دن سے جس میں وہ بے ہوش ہوں گے۔''

مُلَاقٍ ج: مُلَاقُوْنَ-اسم الفاعل ہے۔ملاقات کرنے والا۔﴿ اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ ﴾ (69/الحاقۃ:20) ''بیشک مجھے گمان تھا کہ میں ملاقات کرنے والا ہوں اپنے حساب سے۔''﴿ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ﴾ (2/البقرہ:223)''اور بچو اللہ سے یعنی اس کی ناراضگی سے اور جان لو کہ تم لوگ ملاقات کرنے والے ہو اس سے۔''

تِلْقَاءُ تِفْعَالٌ کا وزن ہے۔علمائے کرام نے بتایا ہے کہ اس وزن پر عربی میں دو ہی الفاظ آتے ہیں، ایک تِبْيَانٌ اور دوسرا تِلْقَاءُ۔تِلْقَاءُ کے متعلق ایک رائے یہ ہے کہ یہ لَقِيَ يَلْقٰى کے متعدد مصادر میں سے ایک مصدر ہے۔دوسری رائے یہ ہے کہ یہ باب مفاعلہ کا ظرف ہے یعنی ملاقات کی جگہ یا سمت۔صاحبؒ لغات القرآن فرماتے ہیں: تِلْقَاءَ طرف، لِقَاءُ سے، جس کے معنی ملاقات کرنے کے ہیں۔اسم ہے۔ملاقات کرنے اور آمنے سامنے ہونے کی جگہ کو تِلْقَاءَ کہتے ہیں اور اسی اعتبار سے طرف اور جہت کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔(لغات القرآن، ج۲،ص:۱۸۰)''﴿ تِلْقَآءَ اَصْحٰبِ النَّارِ ﴾ (7/الاعراف:47)''آگ والوں کی طرف۔''﴿ وَ لَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ ﴾ (28/القصص:22)''اور جب موسیٰؑ مدین کی طرف ہو لیے۔''فَعَلَ الْاَمْرَ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِهٖ کا مطلب ہوتا ہے کہ اس نے اس کام کو خود بخود، بغیر کسی کے مجبور کیے ہوئے، اپنے جی سے کیا۔جیسے فرمایا:﴿ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ﴾ (10/یونس:15)''آپؐ کہہ دیجیے میں یہ نہیں کرسکتا کہ اس میں اپنے جی سے ترمیم کردوں۔''(ترجمہ ماجدیؒ)

(تفعّل) تَلَقِّیٌ بتکلّف کسی کے سامنے آنا۔شوق اور رغبت کے ساتھ کسی کا استقبال کرنا اور اُس کو قبول کرنا (معارف القرآن)۔ بتکلّف کسی سے کچھ حاصل کرنا۔سیکھنا۔﴿ فَتَلَقّٰۤی اٰدَمُ مِنۡ رَّبِّہٖ کَلِمٰتٍ ﴾(2/البقرہ:37)''تو سیکھے آدمؑ نے اپنے رب سے کچھ کلمات۔''﴿ لَا یَحۡزُنُہُمُ الۡفَزَعُ الۡاَکۡبَرُ وَ تَتَلَقّٰہُمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ ؕ﴾(21/الانبیاء:103)''ان لوگوں کو غمگین نہیں کرے گی بڑی گھبراہٹ اور استقبال کریں گے ان کا فرشتے۔''

مُتَلَقٍّ اسم الفاعل ہے۔ لینے والا۔ اس کا تثنیہ مُتَلَقِّیَانِ (دو لینے والے) قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے۔﴿ اِذۡ یَتَلَقَّی الۡمُتَلَقِّیٰنِ عَنِ الۡیَمِیۡنِ وَ عَنِ الشِّمَالِ قَعِیۡدٌ ﴿۱۷﴾ ﴾(50/ق:17)''جس وقت دو لینے والے جا لیتے ہیں ایک دائیں طرف اور ایک بائیں طرف بیٹھا ہوا ہے۔''(ترجمہ احسن البیان)

تُلَقّٰی مضارع مجہول ہے۔اصل میں تُتَلَقّٰی تھا۔ایک 'ت' حذف ہوگئی۔مطلب ہے اُسے سکھایا جاتا ہے۔﴿ وَ اِنَّکَ لَتُلَقَّی الۡقُرۡاٰنَ مِنۡ لَّدُنۡ حَکِیۡمٍ عَلِیۡمٍ ﴿۶﴾ ﴾(27/النمل:6)''بے شک آپ ﷺ کو اللہ حکیم وعلیم کی طرف سے قرآن سکھایا جا رہا ہے۔''(ترجمہ احسن البیان)

نوٹ: باب تفعیل میں مضارع مجہول کی بھی یہی شکل ہوتی ہے یعنی تُلَقّٰی لیکن ان معنوں میں یعنی کسی سے کچھ سیکھنا یا حاصل کرنا باب تفعّل سے ہی استعمال ہوتا ہے۔

(افتعال) اِلۡتِقَاءٌ اہتمام سے ملنا۔﴿ اِنَّ الَّذِیۡنَ تَوَلَّوۡا مِنۡکُمۡ یَوۡمَ الۡتَقَی الۡجَمۡعٰنِ ۙ﴾(3/آل عمران:155)''بیشک جن لوگوں نے منہ موڑا تم میں سے جس دن ملیں دو فوجیں۔''﴿ مَرَجَ الۡبَحۡرَیۡنِ یَلۡتَقِیٰنِ ﴿ۙ۱۹﴾ بَیۡنَہُمَا بَرۡزَخٌ لَّا یَبۡغِیٰنِ ﴿ۚ۲۰﴾ ﴾(55/الرحمٰن:19-20)''اس نے بہا یا دو سمندروں کو وہ دونوں ملتے ہیں، ان کے مابین ایک پردہ ہے، وہ حد سے نہیں بڑھتے۔''

(تفاعل) تَلَاقٍ ایک دوسرے سے ملاقات کرنا۔باہم جمع ہونا۔اس کا مصدر تَلَاقِ قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے۔﴿ یُلۡقِی الرُّوۡحَ مِنۡ اَمۡرِہٖ عَلٰی مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِہٖ لِیُنۡذِرَ یَوۡمَ التَّلَاقِ ﴿ۙ۱۵﴾ ﴾(40/مومن:15)''وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے وہی نازل فرماتا ہے۔تاکہ وہ ملاقات کے دن سے ڈرائے۔''(ترجمہ احسن البیان)

اٰمَنُوۡا (ء م ن) اور دوسرے متعلقہ صیغوں کے لیے البقرۃ آیت 3 دیکھیں۔ قَالُوۡۤا (ق و ل): البقرۃ آیت 8 دیکھیں۔

خ ل و

(ن) خَلَاءً اور خَلۡوَۃً کسی چیز، جگہ یا زمانہ کا خالی ہونا۔تنہا ہونا۔علیحدہ ہونا۔یہ لفظ ظرف زمان اور مکان دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور زمانہ میں چونکہ گزرنے کا مفہوم ہوتا ہے اس لیے یہ گزرے ہوئے زمانے، گزرنے، ہو چکنے اور چھوڑ کر چلے جانے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔﴿ تِلۡکَ اُمَّۃٌ قَدۡ خَلَتۡ ۚ لَہَا مَا کَسَبَتۡ وَ لَکُمۡ مَّا کَسَبۡتُمۡ ۚ﴾(2/البقرہ:134)''وہ ایک امت تھی جو گزر چکی۔اس کے لئے جو اس نے کمایا اور تمہارے لئے ہے جو تم نے کمایا۔''﴿ وَ لَمَّا یَاۡتِکُمۡ مَّثَلُ الَّذِیۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِکُمۡ ؕ﴾(2/البقرہ:214)''اور ابھی آیا نہیں تم لوگوں کے پاس ان لوگوں کی طرح یعنی ان کے جیسے حالات جو گزرے تم سے پہلے۔'' یہ فعل جب اِلٰی کے ساتھ آتا ہے تو معنی ہوتے ہیں تنہائی میں ملنا۔﴿ وَ اِذَا خَلَا بَعۡضُہُمۡ اِلٰی بَعۡضٍ ﴾(2/البقرہ:76)''اور جب تنہائی میں ملتے ہیں ان کے بعض، بعض سے۔''

خَالٍ اسم الفاعل ہے گزرنے والا۔گزشتہ۔اس کی مؤنث خَالِیَۃٌ آتی ہے اور اَیَّامٌ خَالِیَۃٌ کا مطلب ہوتا ہے گزشتہ دن،

گزشتہ ایام۔﴿ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ ﴾(69/الحاقۃ:24)''کھاؤ اور پیو مزے کے ساتھ اُن اعمال کے بدلے میں جو تم گزشتہ ایام میں کر چکے ہو۔''(ترجمہ ماجدیؒ)

(تفعیل) تَخْلِيَةً کسی کو گزرنے دینا۔آزاد چھوڑنا۔چھوڑ دینا۔

خَلُّوْا فعل امر کا صیغہ ہے۔جمع مذکر حاضر۔تم چھوڑ دو۔﴿ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ﴾(9/التوبۃ:5)''پس اگر وہ لوگ توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو تم لوگ چھوڑ دو ان کا راستہ۔''

(تفعّل) تَخَلٍّ بتکلّف خالی ہونا۔﴿ وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ۙ وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ ۙ ﴾(84/الانشقاق:3-4)''اور جب زمین دراز کی جائے گی اور وہ ڈال دے گی جو اس میں ہے اور وہ خالی ہو جائے گی۔''

شَيٰطِيْنُ(ش ط ن) (ش ی ط): اَعُوْذُ بِاللّٰهِ دیکھیں۔ اِنَّمَا: البقرۃ آیت 11 دیکھیں۔

ھ ز ء

(ف۔س) هُزُوًا ، هُزْءًا مذاق اُڑانا۔کسی کا مذاق بنانا۔

هُزُوٌ اسم ذات بھی ہے۔مذاق۔ہنسی۔مذاق کا ذریعہ۔﴿ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۚ ﴾(2/البقرہ:231)''اور تم لوگ مت بناؤ اللہ کی آیات کو مذاق کا ذریعہ۔''

(استفعال) اِسْتِهْزَاءً کسی سے مذاق کرنا۔کسی چیز کو خلاف عقل اور عجیب سمجھ کر مذاق اُڑانا۔﴿ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ﴾(9/التوبۃ:65)''کیا اللہ اور اس کی آیات اور اس کے رسولؐ سے تم لوگ مذاق کرتے ہو۔''

مُسْتَهْزِءٌ ج:مُسْتَهْزِءُوْنَ- اسم الفاعل ہے۔مذاق کرنے والا۔آیت زیر مطالعہ۔

ترکیب 'وٗ' عطف کا ہے۔اِذَا ظرف زمان اور شرطیہ ہے۔فعل لَقُوْا کا فاعل اس میں شامل ضمیر هُمْ ہے اور اَلَّذِيْنَ اسم موصول اور آگے جملہ فعلیہ اٰمَنُوْا اس کا صلہ۔صلہ اور موصول مل کر مفعول ہیں لَقُوْا کے۔جملہ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بطور جواب شرط ہے اِذَا کا۔اسی طرح سے فعل خَلَوْا کا فاعل بھی اس میں شامل ضمیر هُمْ ہے اور اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ متعلق فعل کہلائے گا۔اِنَّ حرف مشبہ بالفعل ہے اور نَا اس کا اسم۔اس کی خبر محذوف ہے۔اور مَعَكُمْ ظرف ہے اور اِنَّ کی محذوف خبر سے متعلق ہے۔اِنَّمَا کلمہ حصر ہے۔نَحْنُ ،مبتدا ہے۔مُسْتَهْزِءُوْنَ اسم الفاعل ہے اور نَحْنُ کی خبر ہے۔

ترجمہ
البقرۃ:14

وَاِذَا	لَقُوْا	الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	قَالُوْٓا
اور جب کبھی	وہ لوگ ملتے ہیں	ان لوگوں سے جو ایمان لائے	تو وہ کہتے ہیں

اٰمَنَّا ۚ	وَاِذَا	خَلَوْا اِلٰى	شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ	قَالُوْٓا
ہم ایمان لائے	اور جب بھی	تنہائی میں ملتے ہیں	اپنے شیطانوں سے	تو کہتے ہیں

اِنَّا	مَعَكُمْ ۙ	اِنَّمَا نَحْنُ	مُسْتَهْزِءُوْنَ ۝
بیشک ہم	تمہارے ساتھ ہیں	ہم تو بس	مذاق کرنے والے ہیں

نوٹ آیت میں لفظ شَيٰطِيْنُ کے بارے میں حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں:''شیطان کا لفظ عربی میں بڑا وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ہر سرکش اور ہر بھڑکانے والے کو شیطان کہتے ہیں۔انسان، جنات، حیوانات سب پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔یہاں شیاطین سے مراد رؤساء یہود و منافقین لیے گئے ہیں جو اپنی سرکشی و طغیان کے لحاظ سے خود ہی شیطان بنے ہوئے تھے۔نیز اُن کے کاہن جن کے یہ لوگ بہت معتقد تھے۔''